جولائی
۲۰۱۱ء

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد ۲۳، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۱ء/ شعبان ۱۴۳۲ھ

مشمولات

آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟	مدیر	۲
○ تعلیم و تربیت		
تعلیم کے روحانی اور تربیتی اہداف	احمد جاوید	۳
تربیت کی فکری بنیادیں	ڈاکٹر محمد امین	۱۱
پاکستان کی ترقی میں تعلیم کا کردار	پروفیسر ارشد جاوید	۲۶
○ تفہیم مغرب		
تہذیب مغرب کی فکری بنیادیں (۲) یونانی و رومن اثرات	احمد جاوید	۲۹
مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج ایک فکری نشست	سید خالد جامعی، ڈاکٹر عبدالوہاب سوری	۳۹
ڈائیلاگ		
مغربی تہذیب سے مرعوبیت کیوں؟	عبدالرشید ارشد	۴۶
سائنس و ٹیکنالوجی اور مسلم ترقی	انوار عباسی	۵۲
○ تفہیم دین		
وسطیہ: اسلام کا فلسفۂ اعتدال (۲)	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی	۵۶
○ مدیر کے نام	ادارہ	۶۳
○ ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات	ادارہ	۶۴

آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ ہم دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پونے دو ارب مسلمان ایک امت بن کر سوچیں اور امت کی سطح پر سوچیں؟ ہمارا مسئلہ واضح ہے، دو اور دو چار کی طرح کہ ہم اپنے نظریے کے ساتھ اور اس کے مطابق جینا چاہتے ہیں، دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے۔ اور مغربی تہذیب و عالم کفر ہمیں دبائے رکھنا چاہتا ہے، اپنے راستے پہ چلانا چاہتا ہے تاکہ ہم ان کی غلامی پہ قانع رہیں، تاکہ ہمیں دنیا میں سربلندی ملے نہ آخرت میں کامیابی۔

اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امت کے مختلف لوگ، مختلف طبقے کئی طرح سے جدوجہد کررہے ہیں؛ کچھ تعلیم و تربیت کے شعبے میں، کچھ دعوت کے میدان میں، کچھ پُرامن سیاسی جدوجہد کے ذریعے اور کچھ میدان جنگ میں کفر کی مزاحمت کرتے ہوئے۔ اور حالت یہ ہے کہ یہ چاروں گروہ ایک دوسرے کا گریباں پکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کہتا ہے تم غلط ہو، دوسرا کہتا ہے تم گمراہ ہو۔ حالانکہ چاروں کا مقصد ایک ہے، ان کی منزل ایک ہے، وہ منزل کی طرف رواں دواں ہیں، صرف منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔

آخر ہم اپنے اپنے مکتب فکر، دائرہ کار اور نقطۂ نظر سے اوپر اٹھ کر کیوں نہیں سوچتے؟ ہم ایک امت بن کر کیوں نہیں سوچتے؟ ایک امت کی طرح کیوں نہیں سوچتے؟ ایک دوسرے کو ہمدردی، محبت، توجہ اور اخلاص کی نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ بالآخر ہم ایک ہیں، ہماری منزل ایک ہے، ہمارا مقصد حیات ایک ہے، اور ہمارا دشمن بھی ایک ہے (الکفر ملۃ واحدہ) جو نہیں چاہتا کہ ہم ایک ہوں، ایک رہیں اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

امت یہود کے، مٹھی بھر لوگوں نے، مل بیٹھ کر سوچا، پروٹوکولز بنائے، ان کے مطابق جدوجہد کی اور کامیاب ہوئے، ہمارے دیکھتے، حالانکہ وہ مٹھی بھر تھے اور ہم تو کروڑوں اربوں ہیں۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ تعلیم و تدریس والے، دعوت والے، پُرامن سیاسی جدوجہد کرنے والے اور کفر کے خلاف مسلح مزاحمت کرنے والے سب ایک جگہ مل بیٹھیں، اپنے اپنے طریقے پر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو ہمدردی سے سنیں، اختلاف رائے کو برداشت کریں، ایک دوسرے کے اخلاص کی قدر کریں، باہم مشاورت کریں اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں کہ بالآخر منزل تو سب

کی ایک ہے۔اس اتحاد میں مانع کیا ہے؟ آخر ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

احمد جاوید☆

تعلیم کے روحانی اور تربیتی اہداف

میرے لیے یہ واقعتا اعزاز کی بات ہے کہ انسانی معاشرے میں جس طبقے کو سب سے زیادہ اہمیت اور مرتبت حاصل ہے یا ہونی چاہیے، اس کے چند بہترین نمائندوں کے سامنے مجھے اپنی چند معروضات پیش کرنے کا موقع مل رہا ہے، میں اس کے لیے منتظمین کا بہت ممنون ہوں۔

جو عنوان مجھے تفویض کیا گیا ہے اس کے حوالے سے کچھ ابتدائی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ایک تو یہ کہ ہمارا جو نظریۂ علم ہے، ہمارا تصورِ تعلیم ہے (ہمارا سے مراد مسلم سوسائٹی کا) وہ اپنے دین سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہمارے اس تصورِ تعلیم کا کوئی بھی مقصد پورا نہیں ہوسکتا، اس کا کوئی بھی سرا اُس وقت تک پکڑا نہیں جاسکتا جب تک ہم اُس کے اِس مطالبے کو تسلیم نہ کرلیں کہ تعلیم کا مقصد انسان کی روحانی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ روحانی ضرورت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روحانی سطح پر ایک تعلیمی سیلف ہوتا ہے یعنی جو ہماری روحانی شخصیت ہے وہ ہمارے اُس ایمان سے تشکیل پاتی ہے، اُن عقائد سے اس کی تعمیر ہوتی ہے جن عقائد کے بارے میں ہمارا دعویٰ اور یقین یہ ہے کہ ان سے ہم پوری زندگی کو Define کرسکتے ہیں۔ زندگی اپنی بنیادی اور اخروی تمام تفصیلات میں ہمارے ایمانیات سے Define ہوسکتی ہے۔ یہ روحانی شخصیت ہے، یہ ہمارا روحانی وجود ہے جو تعلیم کا سب سے پہلا مقصد ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے کہ جس کے مقابلے میں دیگر تمام مقاصدِ علم ضمنی اور ذیلی مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا مقصد تعلیم کا یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی زندگی کی فلاح کا ہر ممکن سامان فراہم کریں کیونکہ ان ضرورتوں کی تکمیل ہی سے ہمارے دنیاوی مفادات وابستہ ہیں مثلاً ہمیں دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ ہم یہاں پر دستیاب تمام مفادات کو حاصل کرنے کی بلا روک ٹوک کوشش کریں۔ دنیا مفادات کا گڑھ ہے، نقصانات کی جگہ ہے۔ ان مفادات میں سے وہی مفادات میرے لیے اور آپ کے لیے قابل قبول ہونے چاہئیں جو میرے روحانی مفادات سے متصادم نہ ہوں۔ یہاں مجھے اُن ہی نقصانات سے بچنا ہے، جو میرے لیے روحانی نقصانات کا سبب ہوں۔ تو یہ نقطہ یاد نہ رکھنے سے کوئی سوسائٹی یا کوئی قوم اس دنیاوی زندگی میں اپنے وجود کی روحانی اور نظریاتی بنیادوں کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

☆ مربی، محقق، دانشور اور ادیب (اقبال اکیڈمی، لاہور)

مطلب یہ کہ فرد اور قوم یہ فیصلہ کرلے اور اس فیصلہ پر قائم رہنے کی ضروری صلاحیت حاصل کرلے کہ اس کا مفاد وہی ہے جو اس کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اور اس کا نقصان وہی ہے جس کو نقصان کہہ کر ہمارے سامنے ہمارے دین کی طرف سے رکھا گیا ہے اور باقی ہر فائدہ، ظاہر میں نظر آنے والا فائدہ ہے، ہر نقصان محض دکھائی دینے والا نقصان ہے۔ اس تصور پر ہماری زندگی کی تمام قدریں استوار ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کی تمام قدروں اور ایمانی مطالبات کو ایکچولائز (Actualize) کرنے کا سامان نہیں کرتے تو ہم گویا اپنے قوی موقف پر قائم رہنے کی صلاحیت سے دستبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔

موجودہ صورت حال میں یہ ممکن نہیں ہے کہ میرا روحانی وجود (Believing Self) اس زندگی کے دائرے میں رہتے ہوئے نشوونما پائے اور پھر میرا دنیاوی وجود، میری دنیاوی صلاحیتیں اس دنیا میں مفید نہ ہوں اور اس دنیا میں پیدا ہونے والی کسی بھی صورتِ حال کو اپنے لیے مفید بنانے پر قادر نہ ہوں۔

مقصدِ تعلیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لیے معلم کا لفظ اور معلم کی ذمہ داری کو تمام ذمہ داریوں پر ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معلم ہونا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معلم ہونے کی سنت کو مسلم سوسائٹی نے سیکڑوں برس اپنی بساط کے مطابق کامیابی سے محفوظ، مضبوط اور متواتر رکھا ہے۔ یہ مسلک اور یہ توازن سرسید کے آنے کے بعد ختم ہوا۔ اس سے پہلے پوری عالم گیر سطح پر امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ تعلیم کو اپنی بساط بھر کچھ خلا، کچھ نقائص کے باوجود اُس کی بنیادی اسپرٹ کے ساتھ عمل میں محفوظ رکھ کے دکھایا۔ وہ سنتِ تعلیم کیا ہے؟ وہ سنتِ تعلیم یہ ہے کہ میرے کردار کی تمام تر بنیادیں روحانی اور ایمانی ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معلم کی حیثیت سے اپنے شاگردوں میں کسی مستقل تربیت کا ایسا کوئی نظام نہیں بنایا کہ جو زیادہ ذہین ہے، جو زیادہ پڑھا لکھا ہے وہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف یہ دیکھا کہ میری تعلیم کے روحانی، ایمانی اور نفسیاتی احساسات جس شخص میں زیادہ پورے ہوتے ہیں وہ میری لائی ہوئی تعلیم کے نظامِ مراتب میں اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔

توسب سے پہلے یہ تصور درست کرنا چاہیے کہ تعلیم کا مقصد ذہن کی کسی خاص Functioning یا محض ذہانت کو فروغ دینا نہیں ہے۔ وہ آدمی نادان ہے جس کا ذہن اس

کے کردار سے غیر متعلق رہ جائے۔ اس وقت جدید آدمی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے یا سب سے بڑے المیوں میں سے ایک المیہ یہ ہے کہ اُس نے ذہن کو پالش کرلیا لیکن ذہن کو وجود کے اور کردار کے جن دوسروں حصوں کی تکمیل میں صرف ہونا تھا ان سے لاتعلق کرلیا۔ اقبال نے بہت اچھا کہا ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

بدقسمتی سے ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم ایسا آدمی تیار کرتا ہے جس کی نگاہ روشن ہو، دماغ چالاک ہو لیکن دل تاریک ہو۔ افسوس کہ ہم اس عیب میں پھنس گئے ہیں اور ہم میں جو تھوڑی بہت تعلیمی استعداد یعنی سیکھنے سکھانے کی استعداد باقی رہ گئی ہے وہ اس مقصد کے لیے صرف ہورہی ہے۔ معاف کیجیے گا ہمارا تصورِ آدمی یہ نہیں ہے۔ ہمارا تصورِ آدمی یہ ہے کہ دل روشن ہونا چاہیے نگاہ چاہے کمزور ہو، دماغ چاہے سادہ اور بھولا ہو۔ ہماری سوسائٹی میں طبیعت کا بھولا، ذہن کا معصوم اور دل کا روشن آدمی بہت قیمتی آدمی ہے، چاہے وہ حرف شناس بھی نہ ہو۔ وہ ہمارے تمام مقاصد کی حفاظت کا زیادہ فعال اور مکمل ذریعہ ہے اُن لوگوں کے مقابلے میں، جن کے ذہن خوب روشن ہیں، جو خوب تحقیق و تفتیش کررہے ہیں، جو خوب ذہین ہیں اور جو تمام موضوعات پر بے تکان بول سکتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمارے نمائندہ لوگ نہیں ہیں۔ ہماری نمائندگی کا نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس ذہن کی بنیاد پر بنایا ہی نہیں ہے۔ اور ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ فرد اور وہ معاشرہ زندہ اور باقی نہیں رہ سکتا جس میں تمام ذہنی صلاحیتیں اس کے کردار کی ضروریات کے تابع نہ ہوں۔ یہ الٹی ترتیب ہے کہ میری بے لگام ذہانت، میرے کردار کو ایک بے لگام حدود میں آزاد چھوڑ کے تشکیل دے۔ یہ ہمارا تصور نہیں ہے۔

ہمارا نظریۂ علم

دوسری بات یہ کہ ہر نظامِ تعلیم کی تشکیل نظریۂ علم اور کسی ورلڈ ویو کے تابع ہوتی ہے۔ ورلڈ ویو ہی یہ طے کرتا ہے کہ ہم دنیا میں اپنے لیے کیا کردار تجویز کرتے ہیں اور اس دنیا میں اپنی نظریاتی نشوونما کے لیے اپنی شخصیت کو کس طرح تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام سوالات یا ان تمام مقاصد کا حصول ایک مکمل نظامِ تعلیم کی موجودگی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے ورلڈ ویو کی تمام تفصیلات منضبط، محفوظ اور معلوم ہیں۔ ایک عام مسلمان کو بھی یہ معلوم ہے کہ تاریخ میں سروائیو(Survive) کرنے کی کیا کیا ضرورتیں ہیں؟ اور اپنی بقاء کا کون کون سا سامان ہمیں کب رکھنا چاہیے؟ ان سب چیزوں سے مسلمان غافل نہیں ہے۔ جولوگ مسلمانوں کے لیے بنیادی فکر لے کر آئے تھے، وہ بھی اس طرف سے معاذ اللہ بے خبر نہیں تھے کہ دنیا میں کامیابی اور بقاء کے لیے ہنگامی ضرورتیں کیا ہوتی ہیں؟ لیکن ہمارے تصورِ دنیا اور ہمارے ورلڈ ویو کی جو سب سے پہلی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، وہ ہے دنیا کی محبت سے مکمل طور پر آزاد رہنا۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے مزاجی مناسبت نہیں رکھتا جو دنیا کی محبت کے صحرا میں ایک ذرے کے اندر بھی گرفتار ہے۔ دنیا کی محبت، مسلم سائیکی میں وہی ضرر رکھتی ہے جو مسلم عقائد میں شرک کا ہے۔ جتنا شرک سے بچنے کا اہتمام ضروری ہے اتنا ہی دنیا کی محبت سے پاک رہنے کی کاوش بھی ضروری ہے۔ افسوس کہ ہم اپنی زندگی کا پورا انداز بدل جانے کی وجہ سے، اپنے ذہن اور طبیعت کا پورا پیراڈائم بدل جانے کی وجہ سے اس مطالبے کی بنیادی اہمیت کی تفہیم سے محروم ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہماری نظر میں یا تو یہ مطالبہ ہے ہی نہیں، اور اگر ہے بھی تو ہم اپنے ذہن کی تمام قوتوں کے ساتھ اور اپنی شخصیت کے تمام میلانات کے ساتھ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس بات کا استحضار نہ کریں۔ ہم اپنے دین کے اس انتہائی بنیادی مطالبے کو اپنی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کو بے مزا کرنے والا یہ مطالبہ ہمارے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔

ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اس روحانی انتشار کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہ نظامِ تعلیم سوائے دنیادار طبقات پیدا کرنے کے اپنا کوئی ہدف نہیں رکھتا۔ اس کے لیے تعلیم کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس تعلیم سے اچھی نوکری حاصل ہوگی اور اُس تعلیم سے اُس سے بھی اچھی نوکری حاصل ہوگی۔ تو گویا نظامِ تعلیم آپ کو دنیا کا نوکر بنانے کی مشین بنا ہوا ہے۔ یہ طرزِ احساس اور طرزِ فکر معاشرے کو تعلیم کے اسلامی اور روحانی پہلوؤں کی طرف کیسے متوجہ کرسکتا ہے؟ جب کہ ان فکری پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا، اور نہ صرف توجہ دلاتا بلکہ ان پر قائم رہنے کی نفسیاتی اور روحانی استعداد پیدا کرنا، آپ جیسے معلمین اور ماہرین تعلیم کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات

اس صورت حال کے اسباب کئی ایک ہیں۔جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کا سب سے بڑا فتنہ سرمایہ دارانہ نظام ہے، یعنی آج اگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے پر دنیا میں نفاذِ حق کی کوئی بھی جدوجہد کی جائے گی تو وہ اپنا سب سے پہلا ہدف سرمایہ دارانہ نظام کو بنائے گی۔اور اگر سرمایہ دارانہ نظام کو دینی فکر اپنا دشمن نہیں مانتی تو معاف کیجیے گا میری رائے میں وہ دینی فکر ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام آپ کو آپ کی تمام اقدار سے محروم کرتا چلا جارہا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے اپنی تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں یہ تجربہ نہیں کیا کہ کوئی ایسا قاتل نظام ہمارے اندر پھیلا دیا جائے جو زندگی کے ہر شعبے میں رسائی رکھتا ہو اور ایک کامیاب دسترس رکھتا ہو۔ یعنی انسانوں میں کوئی ایسا نظریہ اپنے عالمگیر پھیلاؤ کے ساتھ ظہورِ عمل میں نہیں آیا جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ ظہورِ عمل میں آیا ہے۔تو اس نظریے سے لڑنا میری اور آپ کی دینی ذمہ داریوں کی فہرست میں بہت اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام شرک ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے مزاج کے، آپ ﷺ کی تعلیم کردہ معاشرت کی بنیادی اقدار کے اور آپ ﷺ کی شخصیت سازی کے بنیادی اصولوں سے براہ راست متصادم ہے۔ اس نظام کا ادنیٰ پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت پر قائم ہے، یہ دنیا کی محبت کو اتنی کامیابی کے ساتھ استعمال کررہا ہے کہ آج دنیا کا ہر آدمی چاہے وہ دنیاوی اعتبار سے کامیاب ہو یا ناکام، وہ مسلسل ایک ترسنے کے عمل میں مبتلا ہے۔ مطلب یہ کہ اس نظام نے دنیا کو آپ کے لیے اتنا پرکشش اور قابل حصول بنادیا ہے کہ آپ ہر حال میں یعنی آپ اسے حاصل کرلیں تو بھی اُس کے لیے ترستے رہتے ہیں اور اگر آپ اسے حاصل نہ کرسکیں تو بھی اُس کے لیے ترستے رہتے ہیں۔

اس سرمایہ دارانہ نظام نے اب تعلیم کو چند منافع بخش کاروباروں میں سے ایک کاروبار بنادیا ہے۔ یعنی پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم کے فروغ کے لیے کی جانے والی تمام تر کوششیں اصل میں کاروباری کوششیں ہیں اور ان کوششوں میں اساتذہ کا مثبت کردار نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی قوم، چاہے وہ کسی بھی نظریے کی حامل ہو، اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئی جب تک اس قوم نے تعلیم میں مشنری جذبے کو تسلسل کے ساتھ استعمال نہیں کیا۔ اور ہماری تو حالت یہ ہے کہ استاد اگر مشنری جذبے اور زاہدانہ زندگی پر عامل نہ ہو تو اس کی دی

ہوئی تعلیم ہمارے نظریۂ علم میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتی لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں زاہدانہ زندگی کو ایک خوفناک چیز بنا دیا گیا ہے۔ معاشرہ نہ صرف یہ کہ اس سے ڈرتا ہے بلکہ اس طرز زندگی سے واقعتا بعض بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کی موجودہ ساخت میں اسے اختیار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی اب مشنری جذبہ، زاہدانہ طرزِ زندگی کے ساتھ پروان چڑھانا ممکن ہی نہیں رہا۔ تو ان حالات میں یہ جو تعلیم کا کاروبار کرنے والے حضرات ہیں ان کی طرف سے ایسی کوششیں الا ما شاء اللہ ہی دیکھنے میں آتی ہیں کہ یہ اساتذہ کو اس بے رحم معاشرے میں قدم جمانے کے لیے جتنے معاشی تحفظات کی ضرورت ہے وہ فراہم کرتے ہوں۔ ایک مہذب معاشرے میں معاشی اعتبار سے بھی سب سے اوپر اس کے طبقۂ معلمین کو ہونا چاہیے لیکن ہمارے یہاں یہ اتنی نایاب چیز ہے کہ اس کو سوچنا اور بیان کرنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔

بنیادی اوصاف

اس وقت تک میں نے جو عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم مشنری جذبے کے بغیر طلبہ میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ ہماری تعلیم ہمارے Believing Self کو ترقی اور استحکام دینے کے لیے ہے۔ تیسرے یہ کہ ہمارا ہر نظریۂ تعلیم ہمارے ورلڈ ویو کا نمائندہ، ترجمان اور ذریعہ ہونا چاہیے۔ ہماری سائیکی تو یہی ہے کہ ہم ایک ایسا آدمی پیدا کریں۔ سائیکی سے مراد ہے ہمارے کردار کے بنیادی اصول، ہماری ضروریات اور ہماری تربیت سازی کے عمل کے بنیادی مقاصد۔

میں عرض کروں کہ اسلام کا مطلوبہ انسان پیدا کرنا مسلمانوں میں مروج ہر نظامِ تعلیم کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسلام کا طلوب انسان دو اوصاف سے مرتب ہوتا ہے اگر یہ دو اوصاف کسی میں پائے جاتے ہیں تو وہ مسلم سوسائٹی کا ایک مثالی فرد ہے، وہ مسلم سوسائٹی کو فنکشنل (Functunal) رکھنے کا ایک بہت مثالی ذریعہ ہے۔ وہ اوصاف ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت ہیں جس شخص میں ذوقِ عبادت ہے یعنی اس کے لیے سب سے زیادہ مرغوب چیز اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے اور جس شخص میں حسن معاشرت ہے یعنی جس کی سب سے بڑی تگ ودو یہ ہے کہ مجھ سے میرے پڑوسی کو، میرے ساتھی کو فائدہ پہنچ جائے، یہ آدمی اسلام کا مطلوب آدمی ہے۔ اِس

ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت کو مسلم نفسیات میں راسخ اور داخل کرنے کے لیے آپ معلم حضرات کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی تمام تعلیمی سرگرمیاں ان دو مقاصد کو حاصل کرنے میں ہمارے کام نہیں آتیں تو ہمیں اس پورے نظام کو بغیر کسی تاخیر کے رد کر دینا چاہیے اور از سر نو یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ کیسا ہو کہ ہم اپنے شاگردوں کو ان دو مقاصد سے ہم آہنگ کر سکیں۔

ذوقِ عبادت تو ایک زاہدانہ بات ہے جس کی تفصیلات میں جانا شاید اس وقت موزوں نہ ہو لیکن حسن معاشرت تو آپ حضرات کی تعلیمی ضرورت ہے اور اسی کے نہ ہونے سے مسلم سوسائٹی اس وقت سرنگوں ہے۔ مسلمانوں کے اس وقت اس دنیا میں جتنے بھی معاشرے ہیں وہ اسلامی ہونا تو دور کی بات ہے مروجہ معیار سے وہ انسانی بھی نہیں ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ حسن معاشرت کے لیے درکار لوازم ہم اپنے اندر زندہ اور فراہم رکھنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے تصورِ دین میں ایک جارحانہ پن پایا جاتا ہے، ہمارے دینی جذبات میں بھی جارحیت پائی جاتی ہے اور محبت کی بنیاد عنقا نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جن میں کشش ہو، جنہیں دیکھ کر یہ لگے کہ ان کے احساسات اور جذبات کا منبع محبت ہے۔

جس شخص نے اپنے دینی احساسات اور جذبات کو نفرت، غصے اور اس طرح کے جارحانہ رویوں پر استوار کرنے کی عادت ڈال لی ہو تو وہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کا نمائندہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو گردن بھی مارتے تھے تو خیر خواہی کے جذبے سے، مطلب یہ کہ کفار کا مسلمانوں سے بڑھ کر خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ہمیں اس جارحانہ طرزِ فکر کو اپنے اندر سے ختم کرنا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اسوۂ مبارک میں حسن معاشرت بالکل آئیڈیل حالت میں عمل میں لا کر دکھا دی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ افراد نے اس سوسائٹی کو برسوں چلا کر دکھایا اور صدیوں تک اس کے چلنے کا سامان پیدا کر گئے۔ وہ سوسائٹی ایک ایسے فرد پر کھڑی تھی جس کے رویے میں دو چیزیں بہت بنیادی تھیں، ایک تواضع اور دوسرے ایثار۔ جس آدمی میں تواضع نہ ہو اور جس آدمی میں ایثار نہ ہو وہ حسن معاشرت کے قیام کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ مبارک کو دیکھیے کہ آپ کے یہاں تواضع کی سطح کیا تھی؟ ہم کیا تواضع اختیار کریں گے، ہم تو اتنے نیچے پڑے ہوئے ہیں کہ اس سے نیچے کوئی جگہ ہی نہیں

ہے، تو ہماری کیا تواضع ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع دیکھیے کہ جنت کی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کُرتے پر لگے ہوئے ایک بٹن کے برابر بھی ہو۔ آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح جنگ کرتے ہیں؟ وہ کس طرح ایثار کرتے ہیں؟ یہ دیکھیے کہ وہ لوگوں کی کس درجے کی بدتمیزیوں پر درگزر فرماتے ہیں؟ یہ دیکھیے کہ اپنی واقعی شان کا اظہار اپنے کسی جملے سے اُس وقت تک نہیں کرتے جب تک اس کا حکم نہ ہو۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو وحی بھیجنی پڑتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی شان بتانے سے خائف تھے، یہ ہوتی ہے تواضع۔ اور یہ تواضع اسی میں ہوتی ہے جس میں ذوقِ عبادت ہوگا۔ ایثار کہتے ہیں اپنے بھائی کے لیے اپنے حق سے دستبرداری، خوش دلی کے ساتھ اور یہ ایثار بھی وہ بنیادی وصف ہے جو ہر مسلمان کی شخصیت کا لازمی جزو ہونا چاہیے یہ اخلاص کا لازمی تقاضا ہے۔ اس کا متضاد ہے خود غرضی اور ایک سچا مسلمان کبھی خود غرض نہیں ہوسکتا۔ اب اگر آپ کا طالب علم، آپ سے تربیت اور تعلیم پانے والا بچہ ان دو اوصاف کو پیدا کیے بغیر آپ کے ادارے سے پاس ہوکر نکل جاتا ہے تو یہ بہت زیادہ فکر کی بات ہے، یہ بہت زیادہ ڈرنے کی بات ہے۔

معلم کا کردار

تعلیم کتابوں سے نہیں ہوتی، تعلیم نصاب سے نہیں ہوتی، تعلیم معلم سے ہوتی ہے۔ یہی معلم اپنے آپ کو ایک دینی ماڈل کے علاوہ ایک معاشرتی ماڈل کے طور پر بھی اپنے بچوں بچیوں کے سامنے رکھے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ بچے بچیوں میں یہ دو اوصاف جڑ نہ پکڑلیں۔ بدقسمتی سے ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں وہاں والدین کے تربیت دینے کا ذکر کم سے کم ہوتا جارہا ہے اور والدین بچوں کی تربیت کو اپنی ذمہ داری ہی نہیں سمجھتے تو ایک ایسے معاشرے میں معلم کی ذمہ داری روایتی معاشروں سے کہیں زیادہ ہے۔ میں اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ میرے لیے (اور میرے ساتھ والوں کے لیے) سکول کے زمانے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مجھے اپنے والد سے زیادہ محبت ہے یا اپنے اساتذہ سے، بلکہ میرے لیے آج بھی یہ مشکل ہے کہ میں نے سکول میں جن اساتذہ سے پڑھا تھا مجھے ان سے زیادہ محبت ہے یا اپنے والد سے۔ اور بعض اساتذہ ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا دل یکسو ہوکر کہتا ہے کہ ان سے مجھے وہ محبت ہے جو اپنے والد سے بھی نہیں ہے۔ آپ یہ سوچیں کہ آپ کے بارے میں آپ کا کوئی طالب علم اس

مشکل میں گرفتار ہے؟ اگرنہیں تو یہ بڑی کمی کی بات ہے۔ میرے نزدیک وہ شخص معلم ہونا کوالیفائی نہیں کرتا جو اپنے طالب علم کے لیے ایسا آئیڈیل نہ بنے کہ وہ اس کے متعلق محبت کے مذکورہ جذبات نہ رکھے۔ میرے کم ازکم بیس اساتذہ ایسے ہیں جن کے بارے میں آج سوچتا ہوں تو مجھے رونا آنے لگتا ہے۔ اُن کا خیال دل میں لاتا ہوں تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔۔۔اور یہ دینی تعلیم کے اساتذہ نہیں ہیں سکول و کالج کے اساتذہ ہیں اور میں ان کے بارے میں واقعتاً فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میں اپنے والد سے ان سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔

تو اس حوالے سے اپنے شاگردوں کے لیے خود کو آئیڈیل بنانے کے لیے جدوجہد کریں اور آپ اُسی وقت اپنے شاگردوں کے آئیڈیل ہیں جب وہ اس مشکل میں گرفتار ہوجائیں اور یہ فیصلہ نہ کر پائیں کہ انہیں آپ زیادہ عزیز ہیں یا ان کے حقیقی والد؟ تو اللہ آپ کو بھی توفیق دے اور مجھے بھی توفیق دے، ہمارے تصورات کو درست کرے اور ان درست تصورات کو قابل عمل بنانے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، جس اخلاص کی حاجت ہے، اس کی بھی وہ ہمیں توفیق دے۔

ڈاکٹر محمد امین

تربیت کی فکری بنیادیں

آج کی نشست کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ طلبہ کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ اب تربیت ایک عملی کام ہے اور یہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ طے نہ کیا جائے کہ تربیت کی اساس کیا ہے؟ ہم طلبہ کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو کس اصول پر؟ تو اس حوالے سے آج کے لیکچر کا موضوع یہ ہے کہ تربیت کی فکری بنیادیں کیا ہونی چاہئیں؟

یہ ''فکر'' کی بات بہت اہم ہے اس لیے کہ اسی کی بنیاد پر ہم یہ طے کرنے کے قابل ہوسکیں گے کہ تربیت سے ہماری کیا مراد ہے اور یہ تربیت کیسے کی جاسکتی ہے؟ اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ بنیادی فکری اساسات کیا ہیں جن پر ہمارا معاشرہ کھڑا ہے؟ لوگ کن باتوں میں یقین رکھتے ہیں؟ ان کی رائے میں زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اب اگر آپ اس بات کو لیں کہ بحیثیت پاکستانی اور بحیثیت مسلمان ہمارا مقصدِ زندگی کیا ہے تو

قرآن وسنت کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان کا مقصدِ زندگی یہ ہوتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہوجائے، آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوجائے۔

۔{**مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِ □ لَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ**} (الحدید ۲۷:۵۷)

''یعنی پیغمبروں کے ذریعے ہم نے پہلی قوموں کو یہی پیغام بھجوایا تھا کہ ان پر اللہ کی رضاجوئی واجب ہے۔''

۔{**وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ**} التوبہ ۷۲:۹)

''یعنی ہم نے مومنوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کے نیک اعمال کے بدلے میں آخرت میں انہیں ایسے باغات ملیں گے جن میں چشمے بہتے ہوں گے اور عالی شان محل ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور سب سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی کی نعمت جو درحقیقت سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

۔{**اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ**} (التوبہ ۱۱۱:۹)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی زندگی خرید لی ہے اس کے بدلے میں انہیں جنت ملے گی۔''

تو گویا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے یہ ہے کہ آخرت میں اللہ اُس سے راضی ہوجائے اور اُسے جنت ملے۔ یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے۔

اللہ کیسے راضی ہوگا؟ اور آخرت میں ہمیں اُس کی خوشنودی کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے دیا ہے اور وہ طریقہ بھی بتادیا ہے جس پر عمل کرکے ہم آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرسکتے ہیں۔ فرمایا:

{**وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِ □ نسَ اِ □ لَّا لِیَعْبُدُوْنِ**} (الذاریات ۵۶:۵۱)

یعنی ہم نے انسانوں اور جنوں کو سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد سے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہماری پرستش اور اطاعت کریں۔

گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرتے ہوئے اگر اس کی مرضی کے مطابق ہم یہ زندگی گزاریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرت میں اللہ کی خوشنودی ہمیں ملے گی۔ دوسرے لفظوں میں دنیا میں ہمارے کرنے کا جو کام ہے اور جو ہمارا مقصدِ زندگی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق یہ زندگی ہم کیسے گزاریں؟ اس کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے کمالِ مہربانی سے کر دیا ہے۔ وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی ایک بندے کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مختص اور منتخب کر لیتا ہے جنہیں ہم پیغمبر اور رسول کہتے ہیں۔ وہ پیغمبر اور رسول اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہم تک پہنچاتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہم یہ زندگی کس طرح گزار سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ پیغمبر ہمیں اس طرح کی ایک ماڈل زندگی گزار کر دکھاتا ہے کہ یہ نمونے کی زندگی جو اللہ کو مطلوب ہے، اس طرح کی زندگی گزارو گے تو آخرت میں اللہ کی خوشنودی ملے گی۔

پیغمبر یہ کام کیسے کرتا ہے؟ یعنی وہ کیسے لوگوں کو ذہنی وقلبی طور پر اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ برضا ورغبت ایسی زندگی گزاریں کہ ان کا اللہ ان سے راضی ہو جائے! اس کا جواب بھی ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے اور وہ یہ کہ اس غرض سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو جو طریق کار بتایا ہے وہ ہے تعلیم وتزکیہ کا {وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ} (البقرۃ ۲:۱۲۹) یعنی پیغمبر لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور یہ محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریق کار نہیں تھا بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ پہلے پیغمبروں کا طریق کار بھی یہی تھا، چنانچہ فرمایا:

{اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی} (الاعلیٰ ۸۷:۱۸، ۱۹)

یعنی جو پہلے پیغمبر گزرے ہیں اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں تھیں ان میں بھی یہی پیغام دیا گیا تھا کہ تزکیہ ہی سے لوگ کامیاب ہوں گے۔ گویا ہدایت کا فارمولہ ہے تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ۔ اب تعلیم کتاب تو واضح ہے کہ اس سے مراد قرآنِ حکیم کی تعلیم اور وہ تعلیم جو قرآن پر مبنی ہو اور اس کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ لیکن تعلیم حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے (من جملہ دوسری باتوں کے) قرآن کے ماسوا ان علوم کی تعلیم جو فہمِ قرآن کے لیے ضروری ہیں جیسے حدیث، عربی اور فقہ وغیرہ، اور ان علوم وفنون کی تعلیم جن کی انسانوں کو دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے جیسے زراعت وصنعت وغیرہ۔

لیکن قرآن محض تعلیم کی بات نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر تزکیہ کی بات بھی کرتا ہے۔ تزکیہ قرآنی اور شرعی اصطلاح ہے جسے شعبۂ تعلیم میں 'تربیت' کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو لوگوں کی اصلاح اور ان میں مطلوب تبدیلی لانے کے لیے جو دو نکاتی فارمولا عطا فرمایا ہے وہ ہے

تعلیم اور تربیت کا۔

اور قرآن حکیم ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اصل مقصود تزکیہ و تربیت ہے تعلیم نہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں تعلیم و تزکیہ کا حکم آیا ہے وہاں ایک جگہ تزکیہ کا لفظ تعلیم و تربیت سے پہلے آیا ہے اور دوسری جگہ اس کے بعد۔ گویا تعلیم سے اوّل و آخر مقصود تزکیہ ہی ہے اور تعلیم بھی ایک ذریعہ ہے، تزکیہ کے حصول کا۔

یہ 'تزکیہ' کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ تزکیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''ناپسند باتوں کو چھوڑنا اور پسندیدہ باتوں کو اپنانا''۔ یہ جو ہم زکوٰۃ کا لفظ بولتے ہیں اس سے دراصل مراد ہوتی ہے ''زکوٰۃ المال'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مال جو ہم نے کمایا ہے، جو ہماری آمدنی ہے، اسے کماتے وقت ہم سے جو کوتاہیاں ہوگئی ہیں ان کا گند مند نکل جائے اور جو اس کا اجلا پہلو ہے، برکت کا پہلو ہے اس کو مزید جلا مل جائے۔ گویا شخصیت کا تزکیہ یہ ہے کہ انسان ان سب افعال و اعمال کو چھوڑ دے جو غیر فطری ہیں، انسان کے لیے ضرر رساں ہیں، غیر مفید اور بُرے ہیں۔ اور وہ ان اعمال وافعال کو انجام دے جو فطری ہیں، اس کے لیے مفید اور اچھے ہیں۔ یہ ہے تزکیہ۔ اب اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے؟ اس کا انحصار دوسرے معاشروں میں، دوسری قوموں کے لیے کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر ہم مسلمانوں کے لیے اس کی ایک خاص صورت ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ ''مسلم'' کس کو کہتے ہیں؟ مسلم وہ ہے جو اسلام قبول کرے۔ ''اسلام'' کیا ہے؟ اسلام یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کریں غیر مشروط طور پر۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے آیت پڑھی تھی کہ انسانوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے بندگی کے لیے، کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی پرستش کریں۔ اس ''اطاعت'' میں سارے معروفات پر عمل اور سارے منکرات سے بچنا شامل ہے اور یہی تزکیہ ہے۔ اور ہم نے اپنی آزاد مرضی سے، برضا و رغبت اسلام کو قبول کیا ہے یعنی اللہ کی غیر مشروط اطاعت کو قبول کیا ہے تو اب ہم خود فیصلہ نہیں کرسکتے، کوئی مسلمان جو اسلام کو مانتا ہے اور جس نے اسلام کو اپنا طرزِ زندگی بنالیا ہے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے؟ بلکہ یہ فیصلہ اللہ کرے گا کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔ گویا تزکیہ یہ ہے کہ ہم ہر وہ کام کریں جس کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر اس کام کو

چھوڑ دیں جس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے، یہ ہے اسلام میں تزکیہ کا تصور۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں۔ کیسے کریں؟ تعلیم کے ذریعے۔ گویا ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ اصل چیز یہ ہے کہ انسانوں کا، مسلمانوں کا، اس طرح تزکیہ کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاریں تاکہ انہیں آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور رضا وسرفرازی حاصل ہو۔ اب یہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے تعلیم کے ذریعے۔ کون سی تعلیم؟ تعلیم کتاب وحکمت!

اب مقصدِ تعلیم واضح ہوگیا کہ وہ ہے تربیت اور تزکیۂ نفس۔ گویا اگر ہمارا نظامِ تعلیم ایک ایسی شخصیت پروان چڑھا رہا ہے جو اسے عملی مسلمان بناتی ہے تو نظام تعلیم کامیاب ہے اور اگر ہمارا نظام تعلیم ایسا فرد ڈویلپ (Delevop) نہیں کررہا جو اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے تو وہ نظام تعلیم غیر اسلامی ہے، وہ ناقص ہے، وہ غلط ہے، وہ ناکام ہے۔ تو ہمارے نظام تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے طلبہ وطالبات کو ایسی تعلیم دیں، ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ عملی مسلمان بنیں تاکہ وہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزار سکیں اور وہ آخرت میں اللہ کے حضور کامیابی حاصل کرسکیں۔

دیکھیے! یہ بات حتمی ہے کہ جو آدمی اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتا ہے اسے آخرت میں کامیابی ملتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہاں علم کے ساتھ عمل بلکہ صحیح تر لفظوں میں صحیح علم کے ساتھ عمل صالح کی شرط ہے۔ یہاں آپ کا دھیان اس حدیث کی طرف نہ جائے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا وہ جنت میں جائے گا کیونکہ اس حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ جب حضرت ابوہریرہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ پیغام لوگوں کو بتانے جارہے تھے تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک دیا اور انہیں واپس لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اس طرح تو لوگ عمل چھوڑ دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی بات تسلیم فرمائی۔ اس حدیث کا اصل مفہوم یہ ہے کہ صحیح عقیدہ بہت اہم ہے اس کے بغیر اچھے اعمال کا صدور ممکن نہیں اور ہو بھی تو وہ بے معنی ہے۔ نیز صحیح احادیث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ گناہگار مسلمانوں کو بھی پہلے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہوگی پھر ہی وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے گویا اصل چیز عمل ہے۔ عمل کے بغیر کچھ نہیں ہوتا

اورعمل تزکیے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔تزکیہ وتربیت خود بھی ایک عملی کام ہے اور اس کا نتیجہ بھی عمل ہے اور جوشخص کتاب وحکمت کے مطابق اپنا تزکیہ کرلیتا ہے وہ اپنی زندگی عملاً اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے پرقادر ہوجاتا ہے اور آخرت میں اس کا نتیجہ حتمی کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ ہم ذکرکرر ہے تھے فرد کا کہ فرد اگر اپنا تزکیہ کرلے تو دنیا میں اطاعت وعبادتِ رب اور عمل صالح پرقادر ہوجاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ تزکیے کا اجتماعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ معاشرہ چونکہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اس لیے اگر معاشرے کا ہر فرد مزکیٰ (تزکیہ یافتہ) ہوجائے تو پورا معاشرہ مزکیٰ ہوجائے گا۔اور جومعاشرہ مزکیٰ ہوجائے تو اس کے نتیجے میں اسے حاصل ہوتی ہے دنیا کی کامیابی، بلکہ مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ دنیا میں حتمی کامیابی۔اور یہ کوئی خواب وخیال کی بات نہیں،تھیوری کی بات نہیں۔دنیانے دیکھا کہ جب معاشرہ مزکیٰ ہوگیا تو حضرت عمرؓ وعثمانؓ کے عہد میں بارہ تیرہ سال کے اندر دنیا کی سپر پاورز، ایران وروم، ان کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔کیا یہ ایٹم بم چلانے کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کرنے کا نتیجہ تھا؟نہیں! ایٹم بم تو اس وقت تک ایجاد بھی نہ ہوا تھا اور آلاتِ حرب میں بھی مسلمانوں کو اپنے حریفوں پرکوئی فیصلہ کن برتری حاصل نہ تھی۔ یہ فتوحات نتیجہ تھیں قوتِ ایمانی کا،قوتِ کردار کا،جس کا منبع ہے تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ۔۔۔یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے منکر ہیں یا اس کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔نہیں! ہم سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کی اہمیت سے انکارنہیں کرتے لیکن لوگ سطحی سوچ رکھتے ہیں۔ یہ غورنہیں کرتے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کیسے ممکن ہے؟ سائنسی ترقی کے لیے ضرورت ہے قیمتی تجربہ گاہوں اور بڑے تحقیقی وتعلیمی اداروں کی جنہیں چلانے کے لیے خطیر رقوم درکار ہیں جوصرف اسی وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب معاشی استحکام ہو۔معاشی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی استحکام ہو اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ عوام اور حکمرانوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو۔فرد قیادت کی اطاعت کا خوگر ہو،فرد میں اجتماعی ایثار کی خوبی ہو، وہ قوم کے ساتھ مخلص ہو، اپنا کام محنت، دیانت داری اور منصوبہ بندی سے کرے وغیرہ وغیرہ۔تو فرد میں یہ خوبیاں کیسے پیدا ہوں گی؟ صحیح تعلیم اور تزکیے سے، گویا ہم بالآخر وہیں پہنچ گئے کہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے بھی جو بنیادی چیز درکار ہے اس کی بنیاد فرد کی تبدیلی ہے اور فرد تبدیل ہوتا ہے صحیح عقیدے اور ایمان محکم سے، جو نتیجہ ہوتا

ہے تعلیم اور تزکیہ وتربیت کا۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو طویل ہوگیا، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر معاشرے کا، معاشرے کے افراد کا بہترین تزکیہ ہوجائے تو دنیا میں بھی کامیابی ملتی ہے۔ اور یہ مَیں نہیں کہہ رہا، کائنات کے رب نے فرمایا: {وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ} (آل عمران ۳:۱۳۹) تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن بن جاؤ۔ اور دوسری جگہ فرمایا: {وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ} (ہود ۱۱:۵۲) کہ آسمان اپنی برکتیں تم پر نازل کرے گا اور زمین تمہارے لیے خزانے اگل دے گی بشرطیکہ تم میں اللہ کے سچے بندوں والی صفات پیدا ہوجائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تزکیۂ نفس کو اہمیت دی جائے، اگر معاشرے کے اکثر افراد کا صحیح تزکیہ ہوجائے، جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے، تو مسلمانوں کو دنیا میں بھی عزت و وقار اور کامیابی ملے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہوئی لیکن ہماری حالت کیا ہے؟ ہماری حالت یہ ہے کہ آج ہم ذلیل و رسوا ہیں، دنیا میں سب سے کمزور ہیں۔ خون بہتا ہے تو مسلمانوں کا، عزتیں لٹتی ہیں تو ان کی بہو بیٹیوں کی، گھر جلتے ہیں تو ان کے، معاشرہ تباہ ہوتا ہے تو ان کا۔ آج دنیا میں سب سے کمزور، سب سے حقیر اور سب سے ذلیل وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں۔ کیوں؟ وسیع موضوع ہے تفصیل میں جانا اس وقت پیش نظر نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم نے صحیح تعلیم اور تزکیے کو چھوڑ دیا ہے۔ جب ہمارا نظام تعلیم وتزکیہ ٹھیک تھا تو اس کے نتیجے میں طاقت کی ایک لہر اُٹھی جس نے ہمیں ایک ہزار سال تک تقدم عطا کیے رکھا۔ اگرچہ پانچ سو سال بعد چنگیز خان اور ہلاکو نے جو حملہ کیا اس نے مسلم معاشرے کو ایک زبردست جھٹکا دیا لیکن مسلم فکر وتہذیب اس بڑے جھٹکے کو سہار گئی اور مزید پانچ سو سال نکال گئی۔ ایک ہزار سال تک ہماری تہذیب پوری شان وشوکت اور آب وتاب کے ساتھ قائم رہی اور معروف دنیا کے بڑے حصے پر مسلمانوں کا غلبہ رہا۔ وہ علم وتحقیق میں، سوشل سائنسز میں، سائنس وٹیکنالوجی میں، آلاتِ حرب میں غرض ہر شعبے میں ساری دنیا سے آگے تھے۔

اس وقت تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم تباہ ہوگیا ہے۔ ہمارا تزکیہ وتربیت کا نظام خراب ہوگیا۔ اب اگر ہم گرنے کے بعد اٹھنا

چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے تربیت اور تعلیم کے نظام کو ٹھیک کریں۔ ہمارے تعلیم و تربیت کے نظام کو ٹھیک کرنے میں جو موانع اور جو رُکاوٹیں ہیں وہ دو طرح کی ہیں: پہلی جو رکاوٹ ہے میں اسے داخلی سبب کہتا ہوں۔ داخلی سبب یہ ہے کہ ہمارے ایمان لانے کی معنویت ختم ہوگئی ہے ہم نمازیں پڑھ لیتے ہیں، روزے رکھ لیتے ہیں، کچھ لوگ داڑھیاں بھی رکھ لیتے ہیں، کچھ لوگ تسبیح بھی پکڑ لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری اجتماعی حالت نہیں بدلتی اس لیے کہ ہمارا تعلیم اور تزکیے کا نظام غلط ہوجانے کی وجہ سے بحیثیت مجموعی وہ فرد پیدا ہی نہیں ہو رہا جو اسلام کو مطلوب ہے۔ حضرت عمرؓ ایک دفعہ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً اٹھے، منبر پر گئے اور کہنے لگے: ایک وقت تھا کہ عمر چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، یہ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ لوگوں نے کہا کہ جناب یہ کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے کہ مجھے میرا نفس ورغلا رہا تھا کہ تو بڑی شے ہوگیا ہے تو میں نے سوچا کہ اسے اس کی اوقات یاد دلواؤں اور سب کے سامنے جا کر یہ اقرار کروں کہ میں چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ عمرؓ جو چند ٹکوں کے عوض لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا وہ دنیا کا مدبّر اعظم کیسے بن گیا؟ ایک مستشرق نے کہا ہے کہ اگر مسلمانوں میں ایک عمرؓ اور پیدا ہوجاتا تو قیامت تک مسلمان دنیا پر غالب رہتے۔ ایک عمرؓ اگر ان میں اور پیدا ہوجاتا! اتنا بڑا مدبّر، اتنا بڑا فاتح، اتنا بڑا ایڈمنسٹریٹر، اتنا بڑا منصوبہ ساز، دس سال کی حکمرانی میں دو سپر پاورز کو ملیامیٹ کردیا۔ یہ طاقت کہاں سے آئی؟ کیا عمرؓ کے پاس جادو کی چھڑی تھی؟ نہیں! یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نظام تربیت تھا جس نے پتھروں کو ہیرا بنادیا، چرواہوں کو مدبّر اعظم بنادیا، خالد بن ولیدؓ جیسا سپہ سالار اس نے پیدا کیا، حضرت علیؓ جیسا فقیہ اور حضرت ابوبکرؓ جیسا سٹیٹس مین (Statesman) پیدا کیا۔

مجھے میرے لفظوں کے لیے معاف کیجیے گا کہ خدانخواستہ توہینِ صحابہ مقصود نہیں کہ یہ معمولی لوگ تھے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان میں مبعوث نہ ہوتے تو تاریخ میں ان کا ذکر تک نہ ہوتا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو کندن تھے، جس کو مس کیا سونا بنادیا۔ لوہے کو مس کیا تو سونا بنادیا، پیتل کو مس کیا تو سونا بنادیا۔ تو یہ سب اثر تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تربیت کا جس نے بدوؤں کو براعظموں کا حاکم بنادیا۔

تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اصل خرابی ہمارے داخل میں ہے، ہمارے باطن میں ہے۔ اسلام آج

ہمارے لیے قال ہے، حال نہیں۔ معاف کیجیے گا لفظوں سے، وعظوں سے، تحریروں سے دل نہیں بدلتے، دل کردار سے بدلتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ میں کردار پیدا کیا۔ وہ کردار کی قوت اتنی زبردست تھی کہ ہمیں ایک ہزار سال تک آگے کھینچ کر لے گئی یہاں تک کہ ہمارا نظام تعلیم و تربیت بالکل ہی کند ہوکر رہ گیا اور ہم زوال کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم احیا کریں اس نظام تعلیم کا، اس نظام تربیت کا، جس کی بنیاد رکھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے۔اس نظام تعلیم و تربیت کا احیا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ دس ملین ڈالر کا سوال ہے۔ میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور بہت لکھا ہے لیکن یہ میرا آج کا موضوع نہیں ہے اس پہ ان شاء اللہ آئندہ کبھی گفتگو ہوگی۔ آج کا موضوع یہ ہے کہ ہماری تربیت کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کا ایک لفظی جواب یہ ہے کہ ہمارے نظام تربیت کی بنیاد اسلام ہے، اسلام کا صحیح تصور ہے۔ جب صحیح تربیت نہ رہی تو ہم زوال پذیر ہوگئے اور آج بھی ہم زوال پذیر ہیں۔ اور اس زوال سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنا نظام تعلیم وتربیت ٹھیک کریں۔ خصوصاً اس وقت تربیت کی بات ہورہی ہے، تزکیے کی بات ہورہی ہے، تو سمجھ لیجیے کہ اصل چیز صحیح تربیت ہے تاکہ آدمی بدلے، جب آدمی بدلیں گے تو ان میں قوت آجائے گی اور وہ قوت آپ کو پھر اسی بلندی پر لے جائے کہ جس پر آپ کبھی تھے۔

یہ تو داخلی رکاوٹ کا ذکر تھا۔ اب خارجی رکاوٹ کو لیجیے۔ وہ کیا ہے؟ وہ ہے ویسٹرنائزیشن (Westernization) یعنی مغربی فکر وتہذیب کا ہمارے دل و دماغ پر غلبہ۔ یہ خارجی رکاوٹ اتنی اہم ہے، اتنی زبردست ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ شاید ہماری داخلی رکاوٹ کا سبب بھی یہی ہے۔ یہاں ابتدا ہی میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ غلط فہمی یہ ہے کہ عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ مغرب اس وقت بالادست ہے، ترقی یافتہ ہے، غالب ہے۔لہٰذا اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، ہم بھی آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی مغرب کی پیروی کرنی چاہیے۔ہمیں بھی ان اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جن پر عمل کرکے مغرب نے ترقی کی ہے۔ اس طرح ہم بھی ترقی یافتہ ہوجائیں گے، یہ بہت بڑی غلطی ہے جس میں اکثر پڑھے لکھے مسلمان مبتلا ہیں۔

صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کی کامیابی چند اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وہ اسباب پیدا کرنے کی صلاحیت انسانوں میں ، معاشروں میں پیدا ہوتی ہے اپنے ورلڈ ویو(Worldview) سے کمٹمنٹ (Commitment) کی وجہ سے۔ ہمارا جو ورلڈ ویو ہے یعنی خدا، رسالت اور آخرت پر ایمان، جب ہماری اس کے ساتھ کمٹمنٹ تھی، اس کے مطابق ہم نے اپنے آپ کو بدلا تو ہم دنیاوی لحاظ سے بھی کامیاب ہو گئے۔ اس لیے کامیاب ہو گئے کہ ہمارے اندر بھی وہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں جو دنیا میں کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ مغرب کا خدا، رسول اور آخرت کا وہ تصور نہیں ہے، بلکہ ہمارے برعکس ان کی مذہبی تعلیمات سے چونکہ سائنسی نظریات ٹکراتے تھے اور ان میں کش مکش پیدا ہوتی تھی اس لیے ان کے مفکرین نے مذہب کو رد کر دیا۔ مغربی تہذیب نے مذہب کو رد کر کے ترقی کی ہے۔ مغربی تہذیب کی فکری بنیاد کیا ہے؟ ہیومنزم (Humanism)، سیکولرزم(Secularism)، ایمپریسزم(Empericism) اور کیپٹل ازم(Capitalism)، اب دیکھیے کہ ہیومنزم کیا ہے؟ ہیومنزم یہ ہے کہ انسان خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے اور اپنا خدا خود ہے۔ بقول سارتر کہ ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں، خدا مر چکا ، ہم اس عفریت کو زندہ کرنا نہیں چاہتے۔ نعوذ باللہ، یہ ہے ہیومنزم۔ سیکولرزم کیا ہے؟ سیکولرزم یہ ہے کہ اگر کوئی خدا ہے بھی تو جسے اس کو ماننا ہے اپنی ذاتی زندگی میں مان لے، اجتماعی زندگی میں اس خدا کو دخل دینے کی بہر حال اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہمارا سیاسی نظام کیسا ہو؟ ہماری معاشرت کیسی ہو؟ ہمارا معاشی نظام کیسا ہو؟ ہمارا قانونی نظام کیسا ہو؟ مغرب کی فکر یہ ہے کہ اس میں اللہ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ یہ انسانوں کا کام ہے، یہ ریاست اور سول سوسائٹی کا کام ہے کہ وہ یہ امور طے کرے، ان امور کے بارے میں فیصلے کرے۔ تو یہ ہے مغرب کا سیکولرزم کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں خدا کو دخل دینے کا حق نہیں۔ ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ شک و شبہ سے ماورا یقینی علم وہ ہے، حق صرف وہ ہے جسے ہم دیکھ سکیں، چھو سکیں، جس کا لیبارٹری میں تجربہ کر سکیں۔ وہ علم کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں کہ جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاسکے۔ عقیدے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو faith ہے، علم نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا، رسول، فرشتوں اور آخرت پر ایمان بے علمی، جہالت اور توہم پرستی ہے۔ یوں مغربی تہذیب اپنی اصل میں الحاد اور بے دینی پر مبنی ہے۔ مغرب کا اگلا اصول ہے کیپٹل ازم یعنی سرمایہ دارانہ نظام۔ اس نظام کا حاصل یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے آخرت کس نے دیکھی ہے۔ دنیا

سے محبت کرو، اس کے لیے جیو، اس کے لیے مرو۔ اس کی بہتری کے لیے ساری تگ و دو کرو۔ یہ اصول بھی اسلام کی عین ضد ہے کیونکہ اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دو۔ اسلام میں دنیا کو آخرت پر قربان کیا جاسکتا ہے لیکن آخرت کو دنیا پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

توخلاصہ یہ کہ مغرب کی جتنی فکری اساسات ہیں وہ اسلام کی مخالف ہیں۔ ہیومنزم اور سیکولرزم کا مطلب ہے خدا کی خدائی کا انکار۔ ایمپریسزم کا مطلب ہے وحی اور قرآن کا انکار۔ سرمایہ داری کا مطلب ہے آخرت کا انکار۔ مطلب یہ کہ مغرب کی جو فکر ہے، نہ صرف اسلامی اصولوں سے مختلف ہے بلکہ ان کی مخالف ہے، ان سے متضاد ہے اور ان کی نفی کرتی ہے۔ چنانچہ اگر مسلمان اسلامی تعلیمات چھوڑ کر مغربی تعلیمات اپنائیں گے تو ان کی شخصیت کش مکش کا شکار ہوکر کمزور ہوجائے گی جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں بھی کمزور اور ذلیل و رسوا ہوں گے اور آخرت میں تو ہوں گے ہی۔

یہ نقطہ اہل مغرب نے بھی خوب سمجھ لیا اور اس غرض سے انہوں نے اپنا نظام تعلیم و تربیت ہم پر مسلط کردیا۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ اسی برصغیر میں آج سے پونے دوسو سال پہلے ایک شخص تھا جس کا نام تھا لارڈ میکالے۔ اس نے تعلیم پر ایک رپورٹ لکھی تھی ۱۸۳۷ء میں، چھپی ہوئی موجود ہے انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔ انگریز جب یہاں آئے تو انہوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا وہ انہیں دبا کر رکھنا چاہتے تھے تا کہ وہ ان کے خلاف اٹھ نہ سکیں، اس کے لیے انہوں نے کئی طریقے اختیار کیے۔ پہلے تو سوچا کہ انہیں عیسائی بنادیا جائے۔ حکومت ہند کی مرضی سے، بلکہ منصوبہ بندی سے پادریوں کا ایک غول یہاں آیا، اور انہوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوشش شروع کی۔ میں داد دیتا ہوں مسلمان علماء کو، اللہ ان کی قبریں منور کرے اور ٹھنڈی رکھے، انہوں نے کہا کہ ہم نے دنیاوی طور پر شکست تو کھالی ہے، غلام تو ہم ہوگئے ہیں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اب اپنا دین بھی بدل لیں۔ تو اس گئی گزری حالت میں بھی، جو کہ علمی لحاظ سے بھی تھی اور فکری لحاظ سے بھی تھی انہوں نے ہار نہیں مانی۔ انہوں نے عیسائیوں کو مناظروں اور مباحثوں میں شکست دی اور وہ شکست کھا کر یہاں سے بھاگے۔ اس کا ریکارڈ موجود ہے چیزیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق دیکھ لیجیے۔ دوسری کتابیں بھی موجود ہیں۔

پھر انگریز نے سوچا کہ اس طرح تو مسلمان قابو میں نہیں آئے تو پھر لارڈ میکالے نے اپنی

رپورٹ مرتب کی۔ اس نے کہا کہ ان کو میٹھا زہر دو۔ ان کا نظام تعلیم بدل دو، ان کا نظام تربیت بدل دو۔ یہ نام کے مسلمان رہ جائیں گے اور اندر سے ہماری تہذیب کے رسیا ہو جائیں گے، اس پر چلنے لگیں گے۔ چنانچہ انگریز نے اس پالیسی پر عمل کیا اور کامیاب ہوا۔

اس وقت فارسی ہماری دفتری اور قومی زبان تھی انگریز نے اسے ختم کر دیا اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا۔ اس وقت محاورہ بنا تھا ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل''۔ یعنی فارسی پڑھ کر نوکری نہیں ملے گی، انگریزی پڑھو۔ یہ ابتدا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی، روٹی کھانے کے لیے، نوکری کرنے کے لیے اور سر سید نے اسی نقطۂ نظر سے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی۔

مغربی تعلیم و تربیت کو اپنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں مغربی تہذیب غالب آ گئی ساری دنیا میں اس وقت مغربی تہذیب غالب ہے، اس کی فکر غالب ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا اور خصوصاً ان کے معاشرے کے بالا دست اور حکمران طبقات کا ذہن یہ ہے کہ مغرب کی پیروی کرو، مغربی فکر و تہذیب کی پیروی کرو تاکہ اچھی ملازمت مل سکے، تاکہ دنیا کی خوشحالی اور کامیابی مل سکے۔ معاف کیجیے گا ہمارے جتنے نصابات بنتے ہیں وہ مغربی فکر کا چربہ ہیں۔ دیکھیے تعلیم کس چیز کو کہتے ہیں۔ میں نے شروع میں تعریف کر دی تھی کہ علم کیا ہوتا ہے؟۔ آپ ما شاء اللہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، علم پیداوار ہوتا ہے نظریۂ علم (Theory of Knowledge) کا اور نظریۂ علم نتیجہ ہوتا ہے ورلڈ ویو کا۔ جیسا کسی کا تصورِ انسان، تصورِ الٰہ اور تصورِ کائنات ہوتا ہے، اسی طرح کا نظریۂ علم وجود میں آتا ہے اور جیسا کسی کا نظریۂ علم ہوتا ہے ویسے ہی اس کے علوم ہوتے ہیں اور ویسی ہی تعلیم ہوتی ہے۔

تو مغرب کی فکر کو جو آدمی مطلوب ہے وہ صرف دنیا کا آدمی ہے، وہ ہر قیمت پر صرف اور صرف دنیا کی کامیابی چاہتا ہے۔ آخرت اور اس کی ترجیح کا تصور وہاں بے معنی ہے، یہ ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ اگر بطور مفروضہ، بحث کی خاطر، ان مسلمانوں کی بات مان بھی لی جائے جو مغرب کی پیروی کر کے دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں اور دنیا میں کامیابی چاہتے ہیں (گو میں اوپر دلائل سے ثابت کر چکا ہوں کہ ایسا ممکن نہیں) تو انہیں سوچنا چاہیے کہ انہیں یہ ترقی و کامیابی کس قیمت پر ملے گی؟ آخرت کی قیمت پر! میرے علم میں آج تک کوئی ایسا مسلمان نہیں آیا جو آخرت کی قیمت پر دنیاوی کامیابی چاہتا ہو، جو یہ علی الاعلان اور شعوری طور پر کہے کہ مجھے دوزخ میں جانا منظور ہے

لیکن مجھے دنیا کی سہولتیں دے دو۔ دیکھیے ہم گناہ گار ضرور ہیں لیکن کسی مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ شعوری طور پر ببانگ دہل زبان سے یہ کہے کہ مجھے آخرت کی ضرورت نہیں، مجھے دنیا دے دو کیونکہ اس سے اس کی ذات کی نفی ہوتی ہے، اس کی شخصیت کی نفی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کوئی گناہ گار مسلمان کسی کمزور اور جذباتی لمحے میں یہ کہہ بھی دے لیکن شعوری طور پر وہ نہیں کہہ سکتا، یہ کہہ کر وہ مطمئن زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ ایک حیوانی سطح کی زندگی تو گزار سکتا ہے لیکن ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ کیونکہ مسلمان کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو شعوری طور پر یہ تسلیم کرے کہ وہ اللہ کا عبد ہے، اپنی مرضی سے دستبردار ہوتا ہے اور اللہ کی مرضی کے آگے بلا شرط سر تسلیم خم کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ مسلمان کی تعریف ہی یہ ہے لہٰذا کوئی مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاروں گا، مغربی تہذیب کے مطابق گزاروں گا اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے مطابق نہیں گزاروں گا۔

دیکھیے! اسلام بھوکوں، ننگوں اور کمزوروں کا دین نہیں ہے۔ یہ بھی دنیا میں کامیابی اور ترقی کی ضمانت دیتا ہے۔ بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں، سچ مچ کے مسلمان۔ میں ایک فرد کی بات نہیں کر رہا، پورے معاشرے کی بات کر رہا ہوں اور دنیا کی کامیابی کی یہ گارنٹی مَیں نہیں دیتا، خود خالق و مالک کائنات دیتا ہے۔ فرمایا: {وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ} تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ معاف کیجیے گا! اللہ جھوٹ نہیں بولتا ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ خراب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جا کے اسے شہد پلایا، اس نے جا کر شہد پلائی، تو اس کے بھائی کے موشن اور تیز ہو گئے۔ وہ گھبرا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا کہ بھائی زیادہ بیمار ہو گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جا کر اسے شہد پلاؤ۔ وہ گیا اور بھائی کو شہد پلایا۔ اس کے موشن اور تیز ہو گئے۔ وہ صحابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور پریشان ہو کر کہنے لگا کہ اب تو اس کی حالت بہت ہی پتلی ہو گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے جا کر شہد پلاؤ۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے ادب سے کہا: جناب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر پہلے بھی شہد پلا چکا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹ بول سکتا ہے، اللہ نہیں، اس نے فرمایا ہے کہ شہد میں شفا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے بھائی کو شفا نہ ہو۔ وہ آدمی گیا اس نے اپنے بھائی کو مزید شہد پلایا۔ بتدریج اس

کے بھائی کے پاخانے رک گئے اور وہ ٹھیک ہوگیا۔ اس وقت میڈیکل نقطۂ نظر سے بات نہیں ہورہی کہ وہ کیسے ٹھیک ہوگیا؟ بات یہ ہورہی ہے کہ ہم جھوٹے ہوسکتے ہیں، ہمارا فلسفہ جھوٹا ہوسکتا ہے، لیکن معاف کیجیے گا اللہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ {وَ لَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْم بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ} (الانبیا ۲۱:۱۰۵) ہم نے لکھ دیا ہے، آج نہیں زبور میں بھی لکھ دیا تھا بلکہ اس سے پہلے لوح محفوظ میں ہی لکھ دیا تھا کہ زمین کا اقتدار اللہ کے صالح بندوں کے لیے ہوگا۔ یہ حتمی فیصلے ہیں اللہ تعالیٰ کے۔ اور معاف کیجیے گا اللہ جھوٹ نہیں بولتا، ہم جھوٹ بولتے ہیں، ہمارا ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ ہمارا اسلام کا تصور جھوٹا ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ ہم کفر کے نظام پر عمل کر کے اور اس کی پیروی کر کے یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کامیاب ہوجائیں۔ اصول اور منطق کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہمیں کامیابی نہیں مل سکتی۔ دو کشتیوں کا مسافر کبھی ساحل پر نہیں پہنچتا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔۔۔ یا زیادہ سخت لفظوں میں ''دھوبی کا کتا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا''۔ ۱۹۲۴ء میں اتاترک نے اسلامی خلافت کو اور اسلامی طرزِ زندگی کو ختم کر کے یورپ کی اندھی تقلید شروع کی تھی۔ اس بات کو ۸۳ برس گزر چکے ہیں۔ کیا وہ ترقی یافتہ ہوگئے ہیں؟ کیا ترکی عالم اسلام میں آج سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے؟ کوئی بھی اس کا جواب ہاں میں نہیں دے سکتا۔ اس کا سبب کیا ہے؟

آپ تو ماہر تعلیم ہیں۔ دوسروں سے بہتر اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہم مغرب کی فکر کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیونکہ وہ اپنی اصل میں الحادی ہے، غیر اسلامی ہے لہٰذا وہ فکری کشمکش کا سبب بنتی ہے، کنفیوژن پیدا کرتی ہے۔ یہ فکری انتشار ہماری شخصیت سازی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ مستحکم شخصیت کے لیے فکری یکسوئی ضروری ہے۔ مغربی فکر کی پیروی کر کے آپ فکری یکسوئی سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ایک مستحکم شخصیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر آپ مغربی فکر کے مطابق ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اسلام کو چھوڑ دیں اور مغرب کے فلسفے پر دل و جان سے عمل کریں تو آپ کامیاب ہوجائیں گے۔ دنیا میں کامیاب ہوجائیں گے، آخرت نہیں ملی گی۔ کیونکہ وہ تو مغرب کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

ہم اگر مغربی فکر اور اسلام کو ملا کر جینے کی کوشش کریں گے تو ہم ذلیل ہوں گے، رسوا ہوں گے، دنیاوی لحاظ سے کمزور ہوجائیں گے کیونکہ اس بازار میں کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔ منافقت نہیں چلتی۔ ہاں! کفر چل سکتا ہے بشرطیکہ وہ خالص ہو۔ تو یا تو خالص مسلم بن جایئے یا خالص کافر۔ اسلام کو چھوڑ

کرمغرب کو اپنا لیجیے تو آپ کو دنیا ملے گی۔ اسلام کو اپنا لیجیے تو آپ کو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی۔
لیکن اسلام میں دنیا ملنے کی شرط یہ ہے کہ پورا معاشرہ اسلام پر چلے۔ ایک فرد یا چند افراد نہیں۔
بحیثیت فرد میری اور آپ کی ترجیح کیا ہونی چاہیے؟ آخرت، نہ کہ دنیا لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ دنیا غیر اہم ہے۔ نہیں! دنیا بھی اہم ہے کیونکہ دنیا کی محنت کے نتیجے میں ہی ہمیں آخرت میں پھل ملنے والا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا کرنا سکھائی: {رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ} (البقرۃ ۲:۲۰۱) یعنی دنیا پہلے اور آخرت بعد میں۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا نہیں چاہیے وہ غلط کہتے ہیں۔ دنیا مومن کو مطلوب ہے اس لیے کہ اسے دنیا کی بنیاد پر، اسے دنیا میں بھلائی کی بنیاد پر ہی آخرت میں اللہ کی خوشنودی و کامیابی ملے گی۔ لیکن دنیا میں مطلوب یہ ہے کہ زندگی اللہ کے حکم کے مطابق گزاری جائے۔ سارا معاشرہ اللہ والی زندگی گزارے گا تو دنیا میں کامیاب ہوگا، اکیلا فرد گزارے گا تو کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر ایک دفتر میں پچاس آدمی ہوں اور ۴۹ رشوت لیتے ہوں (جیسے ہمارے ہاں پولیس، ریونیو یا پی ڈبلیو ڈی وغیرہ میں ہوتا ہے) اور ایک آدمی کہے کہ میں رشوت نہیں لوں گا تو وہ ایک آدمی دھکے کھائے گا۔ اسے دنیا میں کامیابی نہیں ملے گی لیکن اسے بھی دنیا میں ایک چیز ملے گی وہ ہے اطمینان قلب {اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب} (الرعد ۱۳: ۲۸) اور یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو کروڑوں روپے سے بھی نہیں خریدی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب کو دنیا کی ہر نعمت میسر ہے لیکن وہ اطمینانِ قلب سے محروم ہیں، اور مغرب میں جو لوگ مسلمان ہورہے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی بے دینی، فکری انتشار اور بے مقصد زندگی سے وہ تنگ آئے ہوئے تھے، اسلام قبول کرنے سے انہیں زندگی میں سکونِ قلب مل گیا۔ یہ وہ دولت ہے جو اربوں ڈالر خرچ کرنے سے بھی نہیں ملتی اور ہر انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو اگر فرد کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنا تزکیہ کرے۔ تزکیہ ہوگا تو کامیابی ملے گی، اور اگر معاشرے کے اکثر افراد کا تزکیہ ہوجائے تو دنیا میں بھی کامیابی ملے گی۔ گویا مسلمان معاشرے کو اگر دنیا میں ترقی کرنا ہے تو اس کا انحصار بھی تزکیے پر ہے۔ تزکیہ کیا ہے؟ تزکیہ یہ ہے کہ شریعت طبیعت بن جائے یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنا سہل ہوجائے، اس کا شوق ہوجائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومن وہ ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے، مومن وہ ہے جو اپنی بہترین چیز اللہ کی راہ میں دے، مومن وہ ہے جس کے دل میں شوقِ شہادت جاگ اٹھے۔ مومن وہ ہے جس سے غلطی ہوجائے تو سزا کے لیے خود عدالت میں پہنچ کر اپنی غلطی کا اقرار اور سزا کا مطالبہ کرے۔ مطلب یہ کہ اللہ کی اطاعت کرنا اور دینی زندگی گزارنا مسلمان کے لیے حکم نہ رہے جو اسے

مارے باندھے بجالانا ہے بلکہ دل کی رغبت اور طبیعت کا شوق بن جائے، مزاج کا حصہ اور تقاضا بن

پروفیسر ارشد جاوید صاحب، جو پاکستان کے معروف ماہر نفسیات ہیں، ان کا یہ مضمون دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ ان کے مؤقف کا لبّ لباب یہ ہے کہ تعلیم بغیر اخلاقی تربیت کے بیکار بلکہ وبال جان ہے اور ہمارے بہت سے مسائل کا منبع بھی، لہٰذا صحیح تعلیم صرف وہ ہے جو اخلاقی تربیت بھی کرے اور اچھے مسلمان، اچھے انسان اور اچھے پاکستانی تیار کرے۔ امین

جائے۔ یہ ہے تزکیۂ نفس۔

تو خلاصہ میری گزارشات کا یہ ہے کہ اسلام میں مقصود یہ ہے، مقصد زندگی یہ ہے کہ آدمی کو جنت ملے، آدمی سے اللہ راضی ہوجائے۔ قرآن نے اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارو گے تو اللہ راضی ہوجائے گا۔ اگر فرد اپنا تزکیہ کرے، قرآن پر عمل کرکے، سنت پر عمل کرے، تو اسے آخرت میں کامیابی ملے گی، حتماً۔ دنیا میں اسے ایک چیز ملے گی اطمینانِ قلب، حتماً۔ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا حتماً کہا ہے کیونکہ میں اپنی طرف سے بات کر ہی نہیں رہا، میں تو اللہ کا قانون اور اس کی سنت بتا رہا ہوں۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ اس کے حکم کے بغیر اس دنیا میں ایک پتہ بھی نہیں ہلتا، نہیں ہل سکتا۔ اور اس سب کا فارمولا کیا ہے؟ {وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ} (البقرۃ ۲:۱۲۹) تعلیم اور تربیت۔ تعلیم ٹھیک ہو، یعنی قرآن کی ہو، قرآن کے حکم کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو۔ اور تربیت بھی اس کے مطابق ہو۔ انسان اس کے مطابق بدل جائے، انسان کی طبیعت اور مزاج بدل جائے۔ انسان کے لیے اللہ کے حکم پر چلنا سہل ہوجائے۔ اس پر چلنے کا شوق پیدا ہوجائے۔ دیکھیے! ایک صحابی تھے، ان سے زنا سرزد ہوگیا، آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس۔ سزا کا پتا ہے، رجم یعنی زندہ انسان کو اتنے پتھر مارے جائیں کہ موت واقع ہوجائے، یہ اتنی دہشت ناک سزا ہے کہ آج کل کے جدید اور مغرب زدہ ذہن کے لیے اس کا تصور کرنا محال ہے تو ان صحابی کو سزا کا پتہ ہے۔ وہ گھر بیٹھ سکتے تھے، نہیں بیٹھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آکر انہوں نے اقرار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، یہ دوسری طرف سے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر منہ پھیر لیا۔ یہ اس طرف چلے گئے اور کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پاگل نہیں ہوں۔ صحیح العقل ہوں لیکن میں پاک ہونا چاہتا ہوں۔ اسی طرح ایک خاتون بھی آئی، عورتیں بڑی کمزور ہوتی ہیں، لیکن وہ خود آئی، اپنی مرضی سے آئی، جرم کا اقرار کیا اور کہا جی مجھے سزا دی جائے۔ یعنی لوگوں میں اتنا جذبہ اللہ کی اطاعت کا پیدا ہوجاتا ہے جب ان کا صحیح تزکیہ و تربیت ہوجائے کہ ایسی سزا پانے کے لیے وہ راضی خوشی تیار ہوجاتے ہیں۔ ایسی سزا جو اندوہناک ہے، جس کا تصور بھی

ہم نہیں کر سکتے۔ تو اصل مقصود کیا ہے؟ اسلام میں تربیت مطلوب ہے بلکہ تربیت ہی مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے تعلیم۔ اس وقت مجھے اس موضوع پر بات نہیں کرنی کہ تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟ یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے جس پر پھر کسی وقت بات ہوگی، ان شاء اللہ۔ اس وقت بات یہ ہو رہی ہے کہ ہمیں تعلیم ہی نہیں تربیت بھی مطلوب ہے، تعلیم سے بھی تربیت ہی مقصود ہے اور صرف تربیت نہیں، اسلامی تربیت یعنی ہمیں اپنے طلبہ کو اچھی ملازمت کے لیے صرف دنیاوی علوم اور مہارتوں کی تعلیم ہی نہیں دینا، انہیں دنیا کے آداب ہی نہیں سکھانے بلکہ جو اصل مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت کے نتیجے میں آپ ایک ایسا انسان، ایسا مسلمان معاشرے کو تیار کر کے دیں جو اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے تا کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہو جائے تا کہ اس کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت کی کامیابی بھی اس کا مقدر بنے۔ یہ ہے اسلام کا نظام تربیت اور یہ ہے اس کی فکری بنیاد۔

پروفیسر ارشد جاوید

پاکستان کی ترقی میں تعلیم کا کردار

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے انسانی خدمات کے حوالے سے انہیں دنیا کا عظیم انسان قرار دیا ہے۔ یہ بچہ انڈیا میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اسے سکول بھیجا گیا مگر اس کا دل پڑھائی میں نہ لگتا تھا، جس کی وجہ سے اس نے چوتھی کلاس میں مدرسہ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ کر دکھانا چاہتا تھا۔ پڑھائی چھوڑ کر اس نے ایک دکان پر ''چھوٹے'' کے طور پر ۵ روپے ماہوار پر ملازمت کر لی۔ یہ بڑی محنت سے دکان پر جھاڑو دیتا اور صفائی کرتا۔ تاہم وہ جلد ملازمت سے اکتا گیا اور دوبارہ سکول جانے لگا۔ مزید دو سال سکول میں پڑھا، مگر اسے تعلیم میں دلچسپی نہ تھی، چنانچہ ۱۳ سال کی عمر میں اس نے تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد اس کا خاندان بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ یہ پندرہ سالہ بچہ غریبوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ یہ اونچے خواب دیکھتا۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ غریبوں کے لیے ہسپتال بنائے گا، غریبوں کی ٹریننگ اور ملازمت کے لیے ایک فیکٹری بنائے گا، معذور لوگوں کے لیے ایک گاؤں بسائے گا۔

ان تمام منصوبوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے اپنے شہر میں کام شروع کیا۔ یہ بچہ ہول سیل میں پنسلیں، ماچسیں اور دستی تولیے خریدتا۔ پنسلوں اور ماچسوں کو ایک ٹرے میں سجاتا

اور تولیوں کو کندھے پر رکھتا اور شہر کے مصروف بازاروں میں چل پھر کر یہ چیزیں فروخت کرتا۔ اس طرح جب اس نے کچھ پیسے جمع کر لیے تو اس نے ایک ریڑھی کرائے پر لی، اس پر موبائل پان شاپ بنائی اور گھوم پھر کر پان فروخت کرنے لگا۔

اس دوران میں اس نے کچھ رقم جمع کر لی جو دو ہزار تین سو روپے تھی۔ اس رقم سے اس نے ایک چھوٹی سی دکان خریدی اور اپنی ذاتی ڈسپنسری کا آغاز کیا۔ اس ڈسپنسری سے لوگوں کو کم قیمت پر ادویات اور علاج و معالجہ کی سہولت مہیا کی جاتی۔ ڈسپنسری ۲۴ گھنٹے کھلی رہتی۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا۔ وہ ساری رات دکان پر موجود رہتا۔ جب مریض نہ آتے تو وہ ڈسپنسری کے باہر سیمنٹ کے بینچ پر سو جاتا۔ دن بھر کی مشقت کی وجہ سے اسے پتھر پر بھی گہری نیند آتی۔ بعد ازاں اس نے ایک پرانی وین خریدی، اسے رنگ روغن کر کے اپنی پہلی ایمبولینس سروس شروع کی، جسے اس نے ''غریب وین'' کا نام دیا۔ اب عبدالستار ایدھی نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس بلکہ بہت سے رفاہی ادارے چلا رہے ہیں۔

دنیا بھر میں اس چیز پر زور دیا جاتا ہے کہ بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرلے اور اس میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرے۔ حالانکہ صرف اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ گریڈ کبھی بھی کامیابی اور ترقی کی ضمانت نہیں ہوتے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک ریسرچ کے مطابق کامیابی اور ترقی میں اعلیٰ تعلیم کا کردار صرف ۱۵ فیصد ہے۔

کامیاب، خوشحال اور دولت مند لوگ صرف اپنی تعلیم کی وجہ سے کامیاب اور خوشحال نہیں ہوتے۔ دنیا کے امیر ترین فرد بل گیٹس گریجوایٹ نہیں۔ اکثر کروڑ پتی اور کامیاب لوگ اوسط درجے کی تعلیم اور ذہانت کے مالک ہوتے ہیں۔ پاکستان کے میاں شریف میٹرک پاس تھے۔ وفات کے وقت وہ کم از کم ۳۰ ملوں اور بڑے اداروں کے مالک تھے۔ ان کا ایک بیٹا (شہباز شریف) پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا تین بار وزیر اعلیٰ بنا، دوسرا بیٹا (نواز شریف) دو بار پاکستان کا وزیر اعظم منتخب ہوا۔ اسی طرح چوہدری شجاعت حسین کے والد چوہدری ظہور الٰہی معمولی تعلیم یافتہ اور پولیس سپاہی تھے۔ شہادت کے وقت وہ کئی ملوں کے مالک تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کبھی کسی یونیورسٹی کی شکل نہ دیکھی اور نہ ہی کسی دینی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی مگر انہیں بیسویں صدی کے ان چند مفکرین میں شمار کیا گیا ہے جنہوں نے دنیا کو متاثر کیا۔ ان کی کتب ہر اسلامی ملک میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کی بعض کتب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی بعض کتب کے دنیا کے ۶۷ مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح وارث شاہ ایم۔ اے پنجابی نہ تھے

مگر ان کو پڑھے بغیر ایم۔اے پنجابی کی ڈگری نہیں ملتی۔

اگرچہ اعلیٰ تعلیم، خوشحالی، کامیابی اور ترقی کی ضمانت نہیں مگر اس کی مدد سے کامیابی اور ترقی کا سالوں کا سفر مہینوں میں طے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم کا کامیابی اور ترقی میں کردار بہت اہم ہے۔کوئی بھی قوم سائنس دانوں اور ماہرین (Experts) کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی اور یہ صرف اعلیٰ تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔

پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے تعلیم کے حوالے سے دو معروف نکتہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اگر پاکستان میں تعلیم عام ہوجائے تو ملک ترقی کرے گا اور خوشحال ہوجائے گا۔ یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے کیونکہ صرف تعلیم ترقی اور خوشحالی کی ضمانت نہیں۔سری لنکا نے اس نظریہ کو غلط ثابت کردیا۔سری لنکا میں شرح تعلیم تقریباً ۹۸ فیصد ہے جبکہ سری لنکا کا شمار دنیا کے غریب ممالک میں ہوتا ہے۔ دوسرا نظریہ محسن پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان صرف اس صورت میں ترقی کرسکتا ہے کہ یہاں ٹیکنیکل تعلیم عام ہو۔ یہ نظریہ بہت حد تک درست ہے مگر بدقسمتی سے ۱۰۰ فیصد درست نہیں۔کسی دوسرے ملک میں تو یہ تصور درست ہوسکتا ہے مگر پاکستان میں نہیں۔ ایٹم بم اور میزائل ہم بنارہے ہیں جبکہ ترقی ملائشیا، ترکی اور ایران کررہے ہیں۔ دراصل پاکستانی قوم میں شرح تعلیم سوفیصد ہوجائے اور ہر پاکستان ٹیکنیکل تعلیم میں پی ایچ ڈی ہو اور یہاں ہرروز ایجادات ہوں تو بھی پاکستان ترقی کرے گا اور نہ ہی خوشحال ہوگا کیونکہ بدقسمتی سے بحیثیت قوم ہم کرپٹ ہیں۔ ہمارے ہاں تقریباً ۹۸ فیصد لوگ جھوٹے اور بددیانت ہیں، جبکہ سچائی، اور ایمانداری کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی، لہٰذا ہمارے ہاں اصل مسئلہ تعلیم کا نہیں بلکہ تربیت کا ہے۔ اگر قوم سچی، ایماندار اور باکردار ہوگی تو کم شرح تعلیم سے بھی ملک ترقی کرے گا۔

قوموں کی ترقی افراد کی ترقی کے ساتھ منسلک ہوتی ہے افراد ترقی کریں گے تو قوم ترقی کرے گی۔کامیابی اور ترقی کے چند اصول ہیں اور ہر کامیاب فرد شعوری طور پر ان اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اگر کوئی فرد ان اصولوں سے آگاہ ہوجائے تو اس کی کامیابی کا سفر آسان ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کامیابی اور ترقی کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ کامیابی کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ کیا جائے اور ان میں کامیاب لوگوں کی خوبیاں بھی پیدا کی جائیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کا مقصد حیات اس دنیا اور آخرت کی

کامیابی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر طالب علم اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ محب وطن پاکستانی، ایک سچا مسلمان اور کامیاب انسان بنے۔

اس ضرورت کے پیش نظر ہم نے تعلیم کا ایک خاص نظام تیار کیا ہے جس کا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں بچوں کی اس طرح تعلیم وتربیت کرنا ہے کہ وہ بہترین طالب علم، اچھے پاکستانی، سچے مسلمان اور کامیاب انسان بنیں، یعنی وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کمال حاصل کریں اور انسانیت کے لیے نافع ہوں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے کلاس پریپ سے دہم تک کلاس وار سلیبس تیار کیا ہے جس میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے چھ کتب تیار کی ہیں۔ اس سسٹم سے موجودہ نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی لائے بغیر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے روزانہ یا ہفتہ وار صرف ۳۰ منٹ درکار ہوں گے۔ تعلیمی کارکردگی کو شاندار بنانے اور فرد میں جلد تبدیلی لانے کے لیے نفسیات کے دو جدید طریقے شخصی ہپناٹزم اور NLP استعمال کیے جائیں گے۔ اس خاص نظام تعلیم کی مدد سے پاکستان میں ۱۰، ۱۵ سال میں انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ مزید معلومات کے لیے مجھ سے اس نمبر ۰۳۰۰-۴۹۸۴۴۶۵۵ پر صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا لیکچر احمد جاوید

مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں (۲)

یونانی ورومن اثرات

ہم لوگ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی کچھ جزوی کوششوں میں شرکت کر رہے ہیں۔ وہ بڑا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی تہذیب کو اپنی فنا کے جتنے آثار پیش آسکتے ہیں وہ ہمیں آج درپیش ہیں۔ جن آثار کے ظاہر ہونے کے بعد تہذیبیں صفحۂ ہستی سے محو ہو جایا کرتی ہیں ان آثار کا اپنی تہذیب کے لیے ہمیں اپنے ابتدائی درجے میں سامنا ہے۔ پہلے کی دنیا میں یا یوں کہہ لیں کہ مغربی معیارات تہذیب کے تسلط سے پہلے کی دنیا میں تہذیبوں کو درپیش چیلنجز مقامی ہوتے تھے، جزوی ہوتے تھے اور کبھی اندر سے اور کہیں باہر سے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ہم یہاں یہ مشق کرنے کے لیے بھی بیٹھے ہیں کہ موجودہ طرزِ علم کو آج کل کی بامعنی اصطلاحوں میں بیان کرنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو لہٰذا اس بات کو اس انداز میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے تہذیبیں ایک thesis کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کا anti-thesis محدود نوعیت کا ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ ایک تہذیب کے لیے کوئی دوسری تہذیب جو

محدود جغرافیہ، محدود تاریخ اور محدود وسعت رکھتی تھی وہ کامیاب یا ناکام چیلنج بنا کرتی تھی لیکن مغرب کے غلبہ پا لینے کے بعد سے اب تھیسز تو کئی ہو سکتے ہیں لیکن اینٹی تھیسز واحد اور گلوبل ہے یعنی مغربی تہذیب۔ اِس وقت انسان کے نظام اقدار کو، اس کے نفسیاتی سٹرکچرز کو اور اس کے مادۂ وجود کو اگر کوئی واحد ہمہ گیر چیلنج درپیش ہے تو وہ مغرب ہے یعنی ہر تہذیب اپنی فنا اور بقا کے جتنے مراحل طے کر سکتی ہے وہ تمام مراحل مغرب generate کر رہا ہے۔ یہ صورتحال تاریخ انسانی میں آدمیوں کو کبھی پیش نہیں آئی جس کا ہمیں سامنا ہے اور اس وقت ساری دنیا سے بڑھ کر امت مسلمہ کو ان گلوبل اینٹی تھیسز کا براہِ راست سامنا ہے کیونکہ بقیہ تہذیبیں خود کو اس میں ضم کرنا قبول کر چکی ہیں یہ صرف مسلم تہذیب ہے جو اس تہذیب میں نہ صرف یہ کہ مدغم ہونے سے انکار کر رہی ہے بلکہ اس کے لیے جوابی چیلنج بننے کی تیاری میں بھی ہے لیکن پریشانی یا جذبۂ عمل جگانے والے محرک کی حیثیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی اندرونی استعداد یعنی ہماری تہذیب کے societal Stage اور Psychic Structure اتنے مضبوط نہیں ہیں جو اس آندھی کا سامنا کر سکیں۔

اس درپیش انتہائی غیر معمولی چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری موجودہ تیاریاں مضحکہ خیز حد تک ناکافی ہیں اور اس کے لیے گویا ہمیں نئے سرے سے اپنے تمام اداروں کو restructure کرنا پڑے گا۔ اس پر چند جملے کہہ کے پھر میں مغرب کے تجزیے کی طرف آؤں گا۔ ہماری مذہبیت اپنے مادۂ اخلاق، اپنے حد علم اور اپنے معیارِ عمل میں ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس بڑی زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی بنیاد رکھی جائے۔ لبرل علوم میں ہماری قابلیت ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ اس عینک کو آنکھوں پر چڑھا کر دنیا کو کھنگالنے اور دیکھنے کی کاوش کی جائے۔ ہمارا human substance ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ مغرب کی بنائی ہوئی جھوٹی انسانی اقدار کی چمک دمک کا سامنا کر سکے۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی کو انسانی انفرادیت اور انسانی اجتماعیت تشکیل دینے کے لیے جو جو صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں ہم ان میں سے اپنی کسی ایک صلاحیت پر بھی تکیہ کر کے مغرب سے پنجہ کشی کا ارادہ نہیں کر سکتے اور اس سیلابِ باد و باراں سے بچانے والا سائبان اپنے اوپر نہیں تان سکتے کہ اس کے لیے ہمیں نئے سرے سے اپنے آپ کو اپنے دین کے جوہر سے دوبارہ موجود ہو کر دکھانا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہماری بقاء کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔

ہم یہ آخر میں دیکھیں گے کہ ہمارے دین کا وہ جوہر کیا ہے جو گویا ہمیں خلقت ثانی کے عمل سے

گزارنے کی اب بھی واحد ضمانت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔لیکن اس سے پہلے ڈاکٹر امین صاحب نے میرے ذمے جو ذمہ داری لگائی ہے وہ یہ کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مغرب میں پوری دنیا کے لیے بیک وقت خطرہ اور معیار بننے کی یہ جو قوت پیدا ہوئی ہے اس کا ماضی، اس کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ یعنی مغرب نے خود کو ایک ایسی طاقت میں convert کیسے کر لیا ہے کہ اب انسان اور دنیا کا جو بھی مجسمہ بنایا جائے گا وہ اسی کے گارے سے بنایا جائے گا، اسی کی چھلنی سے چھیلا جائے گا اور اور اسی کے رنگ سے رنگین کیا جائے گا۔ اس کے لیے ہم نے پچھلی مرتبہ دیکھا تھا کہ مغرب کے دو پاؤں ہیں۔ پاؤں سے مراد یہ ہے کہ پاؤں مجسمے میں پہلے بنتے ہیں اور سر آخر میں جا کر بنتا ہے۔مغرب کے عناصر تشکیل میں بلحاظ ترتیب و تاریخ دو عناصر کو تقدم اور اولیت حاصل ہے۔ ایک Hellenization اور دوسرے Romanization یعنی مغرب میں تمدن بننے کی یہ دو بنیادیں ہیں یا یوں کہیے کہ مغرب تمدن بننے کے لائق ان دو بنیادوں پر استوار ہو کر ہوا۔لیکن فی الحال اس کی تاریخی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم اس کے اصول کے بیان کی حد تک محدود رہتے ہوئے کوشش کریں گے کہ جلدی سے مغربِ جدید تک پہنچ جائیں۔

مغرب نے اپنی تہذیب کے لیے دماغ یونانیت سے اخذ کیا گو کہ اس بات میں ذرا سی ٹیڑھ ہے۔اور وہ ٹیڑھ یہ ہے کہ یونانی عنصر رومن ازم سے قدیم تر ہے لیکن مغرب میں رومنائزیشن Christianity سے پہلے ہوئی اور Hellenization بعد میں ہوئی۔لیکن ہم اس تاریخی تقدیم و تاخیر میں پڑے بغیر ان کے اصول بیان کرتے ہیں۔اصول برسرِعمل آنے کے بعد یہ دیکھنا شاید زیادہ مفید نہیں ہوتا کہ کونسا اصول پہلے اخذ کیا گیا تھا اور موجودہ مغرب میں یہ دونوں اصول صَرف ہوئے ہیں۔ اب اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ کس اصول کو انہوں نے پہلے اور کسے بعد میں اختیار کیا۔

Hellenization کہتے ہیں یونانی فکر کا یونان کی حدیں پھلانگ کر اٹلی اور ترکی وغیرہ کے مغرب میں معیارِ علم اور مدارِ نظریہ سازی بن جانا یعنی یونانی ورلڈ ویو کا خود یونان کے حدود کو پھلانگ جانا اس کو کہتے ہیں Hellenization اور Hellenization کا عمل یونانیوں کے ہاتھ سے انجام نہیں پایا بلکہ اطالویوں، رومیوں اور اسی طرح کی غیر یونانی اقوام کے ہاتھوں ہوا حتی کہ اس میں مصری بھی شریک تھے۔ یہ نہ صرف ان لوگوں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا بلکہ اس کا آغاز بھی انہی

اقوام سے ہوا۔Greek Rationale مذہبی تمدن کا تا حال دماغ ہے۔(جب ہم آگے بڑھیں گے تو یہ بات زیادہ واضح ہوکر سامنے آئے گی)۔تہذیب کو دماغ کے ساتھ دوسری جو چیز درکار ہوتی ہے وہ ہےpower۔یعنی دماغ اور طاقت یہ تہذیب کے لازمی عناصر ہیں۔ یہ تہذیب کے دو لازمی ستون ہیں۔ ان دونوں ستونوں کو ایستادہ کیے بغیر تہذیب کی عمارت کو کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔مغرب نے اپنی دماغی صلاصیت یونانیت سے حاصل کی اور اپنی پاور کی ضرورت رومنائزیشن سے پوری کی۔

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ رومن پاور اور یونانی علمیت (episteme) یعنی یونانیوں کا بنایا ہوا دماغ اور رومیوں کا بنایا ہوا جسم یہ مغربی تہذیب کے دو بنیادی ستون ہیں۔ان کی کارفرمائی کے تمام مظاہر ہم مغربِ جدید میں آگے چل کر دیکھیں گے ابھی ہم صرف ان کے اصولِ بعیدہ کی یوں سمجھیں ایک فہرست بنا رہے ہیں۔یونانی ذہن کو اگر ایک فقرے میں بیان کرنا ہو یعنی اہل یونان کی عقلی اور علمی روایت میں کارفرما بے شمار اختلافات کے علی الرغم اگر کوئی اسے ایک فقرے میں بیان کرنا چاہے تو وہ فقرہ میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں ـــــ اس میں اہل یونان منفرد ہیں اور اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے، کوئی پرانی روایت بھی ان کی شریک نہیں ہے ـــــ وہ یہ ہے کہ وحی کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے مابعد الطبیعی (Metaphysical) خلا کو عقل سے کیسے پُر کیا جائے؟ اس کا پوری تاریخ انسانی میں اگر کوئی ایک ماڈل موجود ہے تو وہ یونانی ماڈل ہے یعنی وحی بطور مابعد الطبیعی علم اگر کسی تہذیب کے اصل منبع میں سے غائب ہو تو وہ تہذیب اپنی metaphysics کو rationalise کر کے کس طرح پورا کرنے کی کاوشیں کرتی ہے؟ اس پورے عمل کو آپ سمجھ نہیں سکیں گے اگر یونانی روایت کو نظر میں نہیں لائیں گے۔عقل کی metaphysicality کو اپنی بنیاد بنا کر ایکcosmic order کی تشکیل دینا یہ یونانی فکر کا مقصودِ اعظم رہا ہے۔کوئی بھی عقل جب کوئی بھی cosmic order تشکیل دے گی ـــــ cosmic order کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق کی حقیقت، تخلیق کی غایت اور تخلیق کے mechanics جب یہ سب ایک دائرے میں پہنچ کر define ہو جائیں تو اسے کہتے ہیں cosmic order یعنی کائنات اپنی اصل میں کیا ہے؟ کائنات میرے شعور میں کیا ہے اور کائنات کا وجود اپنے mechanics میں کیا ہے؟ کائنات اپنی physicality میں کیا ہے؟ کائنات اپنی knowability میں کیا ہے؟ کائنات اپنے Essence اور اپنی reality میں کیا ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب اگر سمجھ میں آ گیا تو اس کو

cosmic order کی تشکیل تھا cosmic order کہیں گے ـــ یونانی فکر کا مقصودِ اعظم اس ،وحی کی لازمی رہنمائی سے محرومی کی حالت میں۔ ایک بات یادرکھیے گا کہ وحی کے نہ ہونے سے شعور کو جو پیاس لگی تھی اسے یونانی ذہن نے عقل کے چشمے سے سیراب کرنے کی کوشش کی ہے یہی ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے اور یہی مغربی ذہن کا تا حال سب سے بڑا جوہر ہے۔

اب جست کرکے میں ایک دوسرے مرحلے کو بیان کرتا ہوں کہ جیسے ہندو روایت کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ ان کا مسئلہ تھا reality of knowing یعنی ہندو ذہن act of knowing کا نام تھا۔ اسی منہج پر یونانی ذہن act of being کو حقیقت کا لازمی وصف سمجھتا تھا۔ ہندوؤں کے لیے حقیقت act of knowing کا حاصل تھی، یونانیوں کے لیے حقیقت act of being کا محرک ہے۔ یونانی پیراڈائم (Paradigm) وجود (یعنی being) تھا یعنی یونانی فکر کا محور مسئلہ وجود تھا جب کہ ہندو فکر کا محور مسئلہ علم تھا۔ یونانی فکر کی اس خصوصیت کو واضح کرنے کے لیے ہمیں ہندو روایت کا یہاں ذکر کرنا پڑا۔

یونانی فکر میں سقراط اور افلاطون کو اگر تھوڑی دیر کے لیے الگ رکھا جائے تو وجود اپنی حقیقت اور ماہیت میں انسانی نہیں تھا کائناتی تھا یعنی وجود کو define کرنے کے لیے کائنات کے definer کی ضرورت تھی، شعور کو definer نہیں بنایا جاتا تھا، انسان کو معیار نہیں بنایا جاتا تھا۔ وجود کیا ہے؟ کے سوال کو حل کرنے کی پچاس زاویوں سے بھی کوشش کی جائے تو کہیں بھی انسان کو معیار نہیں بنایا جاتا تھا۔ یونانی ذہن میں سے اگر آپ سقراط کو الگ کردیں کیونکہ سقراط philosopher of being نہیں تھا وہ ایک الگ روایت ہے، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یونانیوں کا تصورِ وجود آفاقی، کونی اور کائناتی تھا یعنی یونانیوں کے نزدیک being ایک آرڈر تھا کوئی ذات نہیں تھی۔ وحی کے خلا سے یہ انہیں جھیلنا پڑا کہ وہ حقیقت کو ذات تک پہنچانے سے قاصر رہے اور کائنات کو مادۂ وجود اور منتہائے وجود مان لینے کی مجبوریوں میں اسیر رہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کائنات کے ساتھ اپنے شعور کی تمام فطری طلب جو مابعد الطبیعیات کے حصول کیلئے درکار تھی صَرف کردی۔۔ یہ میں آپ کو مغرب کا جوہر بتا رہا ہوں مغربِ جدید کا، کہ انہوں نے شعور کے داعیۂ مابعد الطبیعیت کو جو فطرتِ شعور ہے، شعور sense of metaphysicality سے ایک لمحے کے لیے جدا ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شعور کی اس urge of metaphysicality کو وحی کی رہنمائی مہیا نہ ہونے کی وجہ سے

عقل کی انگلی تھام کر چلنے کی مجبوری کی وجہ سے انہوں نے حقیقت کا سارا اسٹرکچر کائنات کی شبیہ پر فرض کر لیا وہ اس کو اس کے self hood تک پہنچنے اور دیکھنے سے قاصر رہے کیونکہ حقیقت کا اور حقیقت الحقائق کا ذات ہونا یہ عقل جن جن logicizations سے مانوس ہے ان میں سے کسی ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ یعنی حقیقت الحقائق کو متحرک بالارادہ، متصدق بالعلم ذات کی حیثیت دے دینا عقل کے پورے منطقی مزاج سے ماورا چیز ہے۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا کہ خلاف ہے لیکن یہ استعداد کہ حقیقت کو ذات میں مشخص کیا جائے وحی کے علاوہ کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے ذاتِ خالق کے اوصاف کائناتی structure of being میں صَرف ہوتے ہوئے دیکھے کبھی فارم کی شکل میں، کبھی pythagorean numbers کی شکل میں، کبھی ارسطو کے Prime Mover کی صورت میں جو ذات بنتے بنتے رہ گیا۔ Prime Mover ایک activity ہے کوئی actor نہیں ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہیے کہ ارسطو کا Prime Mover کوئی ذات ہے۔ ارسطو کا Prime Mover ایک Elementary Reality ہے۔

اب آپ نے یونانی ذہن کا یہ المیہ دیکھا کہ انہوں نے تمام Essence of Metaphysicality کو مادی کائنات میں صَرف کرنے کی کوتاہی مجبوراً کی، جیسے ہمارے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کا عارفانہ قول ہے۔ کاش ہماری مذہبیات میں یہ چیزیں بھی پڑھائی جاتیں ـــــ کہ یونانیوں سے کیا سند لانی وہ تو وجود سے آگے ہی نہیں بڑھتے۔ اس جملے کے معانی ہماری روایت کی تائید میں اتنے ضرور ہیں کہ آج ہماری دستگیری کر سکیں، آج ہمارے ذہنی افلاس کو ختم کر سکیں لیکن اس کے معانی پھر دیکھیں گے۔

مغربی ذہن میں شعور کے مابعد الطبیعی مقتضیٰ کو عالم طبیعی میں ترک کر دینے کا جو رجحان آج تک غالب نظر آتا ہے ان کے فلسفوں میں اور ان کے طبیعاتی علوم میں وہ اس یونانی بیج سے پھوٹنے والا درخت ہے۔ اب آپ سمجھے کہ لنک کتنا ڈائریکٹ ہے کہ جدید فزکس میٹافزیکل claims سے لٹکی ہوئی ہے اور ان سے بھرے ہوئے محسوس علوم کا مجموعہ ہے یعنی جدید فزکس کے سارے claims میٹافزیکل jugdement، میٹافزیکل certainty، میٹافزیکل bindingness اور میٹافزیکل wholeness پر مبنی ہیں۔ یہ جو مزاج پیدا ہوا ہے اس کی اصل، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یونانی فکر میں کارفرما ہے۔

دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کو پاور اور مزاج قوت یعنی تہذیب کو powerfulness کا

مزاج اور پاور کا تصور یہ سارے کا سارا رومنائزیشن سے حاصل ہوا ہے۔ ان کے تصور قوت کو سمجھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ رومن تہذیب کے اصول قوت کو دیکھیے، اس کے استعمال قوت کو دیکھیے، اس کے مصارفِ قوت کو دیکھیے اور اس کی مذہبیتِ قوت کو دیکھیے کہ وہ کیا ہے؟ رومن تہذیب کا مزاج قوت اور نظریۂ طاقت کیا ہے؟

یہ ''ہے غلبہ فائدے کے لیے حاصل کرنا نظریے کے لیے نہیں''۔ یہ ہے رومن Essence of Power کہ طاقت فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کسی نظریے کو پھیلانے اور نافذ کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ فائدہ مستقل ہے، فائدے کی تعریف بدل نہیں سکتی جبکہ نظریے کی تعریف آج کچھ ہے، کل کچھ اور ہے۔ رومن تہذیب کا یہی تصورِ قوت کہ مجھے اپنے فائدے کے لیے اقتدار اور طاقت چاہیے، مجھے مقتول کو قتل کرنے سے زیادہ اس کو نچوڑ دینے سے دلچسپی ہوگی۔ یہی مغربی قوت کا خاصہ ہے۔ یہ تباہی نہیں چاہتی، اپنے مقاتل کو منہدم نہیں کرنا چاہتی، یہ اپنے مفتوح کو گائے کی طرح رکھنا چاہتی ہے اور اسے دودھ دینے کے لیے انجکشن دے دے کر دودھ کی پیدائش میں اضافہ کرنا چاہتی ہے۔ رومیوں کے سسرو (Cicero) کا، اگر کسی نے پڑھنا ہو تو سسرو کے خطوط ضرور پڑھے، وہ رومن تہذیب کے سب سے بڑے نمائندوں میں سے ایک ہے اور ایک فلسفی بادشاہ تھا، اس کا ایک خط ہے اس بارے میں کہ غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ رومنوں کا جہانِ قوت دو بنیادوں پر کھڑا ہوا ہے: آقا اور غلام۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ غلام کو غلطی پر سزا نہ دو جرمانہ عائد کرو۔ اس قول کے مزاج میں ذرا سا غور کریں تو آپ پر ان کا پورا مزاجِ قوت واضح ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے رومنوں نے نسل کشی نہیں کی انہوں نے تاجرانہ فتوحات کی ہیں۔ تو یہ دوسرا مزاج قوت ہے۔

میں نے یہ جو دو باتیں عرض کی ہیں یہ مکمل اصول ہیں، یہ ستون ہیں تہذیب کے۔ اب ان اصولوں کے ساتھ وابستگی، ان پر استواری اور اس استواری کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بہت اہم لیکن ثانوی تفصیلات بہت سی ہیں جیسے ارسطو کا یونانی ذہن کو تبدیل کر دینے والا یہ نظریہ مغرب کی میراثِ تمدن ہے کہ Forms شے سے ماورا نہیں ہوتیں شے میں ہوتی ہیں۔ آپ سمجھے کہ اس سے کتنا بڑا فرق پڑا ہے۔ اس کا استاد کہتا تھا کہ Forms، Ideas، عیان یا حقائق یہ صورت اور شے سے ماورا ہوتے ہیں ان کا عالم اور سکیل ہی الگ ہے۔ شاگردِ رشید نے آ کر کہا کہ کوئی عالم والم نہیں ہے، یہ جو Forms میں، یہ جو حقائق ہیں یہ شے ہی کی properties ہیں۔ اس سے پورا جہانِ فکر

بدل گیا۔ ارسطو کی عظیم الشان شخصیت،اس کی منطق اور empericism میں اس کی unparalleled قابلیت نے اُس کے اِس تصور میں اپنی قوت مجتمع کر کے پورے Greek Episteme کو بدل ڈالا اور یہ ہے موجودہ مغربی Episteme کا سقم کہ Forms کی حقیقت شے سے باہر نہیں ہے شے ہی میں ہے۔ پوری مغربی علمی کائنات اپنے تمام disciplines میں اس بات پر متفق ہے اور اس امر کی طرف یکسو ہے کہ مجھے حقیقت کو شے کے تجزیے کے نتیجے میں حاصل کرنا ہے شے پر کسی اور چینل سے impose نہیں کرنا۔ مجھے شے جو دعوت دے گی سمجھنے کی اسے اسی طرح سمجھنا ہے، مجھے شے کو کوئی نظریاتی معلومیت کی بیڑی نہیں پہنانی۔ یہ مغربی Episteme کا اسم اعظم ہے۔ ان کی فزکس ہو، ان کا فلسفہ ہو، ان کا ادب ہو، ان کا پورا مزاجِ علم ہو، ان کا پورا مادۂ دانش ہو وہ اسی بنیادی تصور (Mother Concept) پر کھڑا ہوا ہے۔ اسی ماں کی اولاد ہے۔

Hellenization اور Romanization سے ذہن اور قوت کا ایک نیا امتزاج پیدا ہوا۔ قوت فائدے کے لیے چاہیے، اب علم بھی فائدے کے لیے درکار ہے۔ یہ وہ نقطۂ اتصال ہے مبنی بر مفاد جو جا کر مغرب کے شجرۂ نسب کے مورث اعلیٰ کی پیدائش کا سبب بنا، جو کیپٹل ازم (Capitalism) ہے۔ کیپٹل ازم علم کی پرستش اور طاقت کی پرداخت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا اور جس کی غایتِ علم اور جس کا منتہائے قوت صرف فائدہ تھا اور اس میں ایسے ایسے لطیفے ہیں جو میرے استاد کے استاد محمد حسن عسکری صاحب نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں اور اس کے علاوہ بھی جان رائٹ کی کتاب ہے '*Organisation Man*' وہ ہر شخص پڑھے، اس میں اس نے بے شمار مثالیں دی ہیں۔ میں ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں کہ کیپٹل ازم کی پیدا کردہ ذہنیت کیسی ہوتی ہے؟

ایک محقق نے نظریہ ارتقا پر کوئی کتاب لکھی، تحقیق کی اور یہ مسئلہ اٹھایا کہ فلاں بات غلط طور پر ڈارون سے منسوب ہوگئی ہے وہ دراصل اسپنسر نے کہی تھی لیکن یہ غلط العام ہو کر ڈارون سے منسوب ہو گئی۔ اس بے چارے محقق نے اس غلط العام کی تصحیح کر دی اور کہا کہ اسپنسر نے فلاں جگہ پر فلاں موقع پر یہ کہا تھا۔ تو پبلشر جو تھا وہ یونیورسٹی تھی اور اس کا پورا پبلشنگ بورڈ تھا۔ اس کے پاس جب یہ کتاب پیش ہوئی تو انہوں نے مصنف کو طلب کیا اور کہا کہ بھئی کتاب تو تمہاری بہت اچھی ہے بس اس میں ایک تبدیلی کر لو۔ بولا: وہ کیا؟ کہا: یہ جو تم نے تحقیق کی ہے یہ ایک پیرے میں تو کی ہے، یہ ایک پیرا نکال دو۔ اس نے کہا جناب یہ ایک پیرا ہی تو کتاب کے زندہ رہنے کی وجہ ہے کہ میں نے ایک غلطی کو درست کیا ہے۔

کہا کہ دیکھو اب سب اس بات کو ڈارون کی بات کے طور پر ماننے لگے ہیں تمہاری اس تحقیق سے بلاوجہ ذہنوں پر بوجھ پڑے گا لہٰذا تم اس کو نکال دو، باقی سب ٹھیک ہے۔ یہ ہے وہ مزاج جس کے لیے حق مفادِ عاجلہ کے لیے اختیار کیا جائے، جس کے لیے قوت فوری فائدے کے لیے استعمال کی جائے۔

مغرب جدید کے اصولِ بعیدہ تو یہ یونانی اور رومن وغیرہ ہیں اور اصل قریبی جو ہے وہ ہے ڈیکارٹ کا نظریہ ثنویت یعنی Dualism اور تاریخ انسانی میں تہذیبی اثر کی اتنی وسعت رکھنے والا شائد کوئی دوسرا نظریہ پیش نہ کیا جا سکے جس نے انسانی شعور، ذہن، تہذیب اور نفسیات کو ہمیشہ کے لیے globe میں دولخت کر دیا ہو اور جس نے انسانوں کو باقاعدہ دو انواع میں بانٹ دیا ہو۔ وہ ہے ڈیکارٹ کا نظریۂ ثنویت یعنی یہ کہ مادہ اور روح، ایک دوسرے سے مختلف وجود پر تو ہیں ہی یعنی مادے کی موجودیت کے اصول وعناصر روح کی موجودیت کے اصول وعناصر سے بالکل ہی مغایر اور بالکل مختلف تو ہیں ہی ان کے اندر معلوم ہونے کا جو طریقہ ہے وہ بھی ایک دوسرے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا ان کے موجود ہونے کا انداز ایک دوسرے کے مخالف ہے۔ گویا روحانی علم کو مادی قانون نہیں بنایا جائے گا اور مادی قانون کو روحانی حجت نہیں بنایا جائے گا۔

اسی اَن گھڑت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے پورے global human perspective کو دولخت کر دیا۔ ڈیکارٹ کی ثنویت اب انسانوں پر ان کی تقدیر نحس کی طرح مسلط ہے اور شاید رہے گی یعنی human perspective اگر دو واضح کیمپوں میں منقسم ہے تو وہ ڈیکارٹ کی ثنویت کی بنیاد پر ہے اور مغرب ڈیکارٹ کی اس ثنویت سے بننے والا ذہن ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ایجاد ہونے والی تہذیب بھی ہے۔ اسے ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سوال و جواب

سوال: آپ کے استاد کون ہیں اور ان کے استاد سے کون مراد ہے؟

جواب: میرے استاد سلیم احمد ہیں اور ان کے استاد حسن عسکری صاحب ہیں۔

سوال: یونانی مائتھالوجی (Mythology) کی بنیاد کیا ہے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایئے کہ جب یونانیوں سے پہلے بہت سے انبیاء آئے تھے تو کیا ان کے اثرات یونان تک نہیں پہنچے؟

جواب: ارسطو کے بعد تو شاید واضح طور پر اب trace ہو گیا ہے یعنی جب اہل یونان اٹلی اور ایشیائے کوچک تک پہنچے تب تک تو trace ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے آگے چل کر انہی میں

Plotinus پیدا ہوا جس نے فکر کو نیا آہنگ دیا لیکن ارسطو سے پہلے تک یہ واضح نہیں۔ بعض مرتبہ شبہ ہوتا ہے کہ Pythagoras وغیرہ وہ حکیم تو نہیں ہیں، شبہ ہوتا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ڈیٹا نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم حتماً کچھ کہہ سکیں کہ وحی کے فراہم کردہ علوم اُس وقت ایک زندہ

کراچی یونیورسٹی سے سید خالد جامعی صاحب اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب جون میں لاہور تشریف لائے تو ہم نے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ان کے ساتھ ایک فکری نشست کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے 'مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے سوال وجواب کا موقع نہ مل سکا۔ البرہان کی تنگ دامنی کی وجہ سے سوری صاحب کی مکمل تقریر نہیں دی جاسکی۔ ایف سی کالج یونیورسٹی کے پروفیسر شاہد رشید صاحب ڈاکٹر سوری صاحب کے مؤقف پر کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں۔ اگلے شمارے میں یہ بحث ان شاء اللہ مکمل ہوجائے گی۔ امین

Presence رکھتے تھے؟ دوسرے یہ کہ تمام فلسفی کسی نہ کسی مذہب کے نام سے مائتھالوجی سے وابستہ رہے اور مائتھالوجی پیدا ہی ایامِ فترت میں ہوتی ہے یعنی وحی ہو اور پھر غائب ہو جائے تو اس کے زمانۂ غیاب میں مائتھالوجی مذہبی عقائد اور مذہبیت کی جگہ لے لیتی ہے۔ Pythagoras سے لے کر حتی کہ سقراط تک مائیتھولوجی سے وفاداری کا اظہار ہوتا ہے لیکن کسی بھی تہذیب میں مائتھالوجی کا وجود یہ بات ثابت کرتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی وحی کا نفوذ اس کی تاثیر یا اس کے قبول کا عمل ضرور ہوا ہوگا جو مدہم پڑ جانے یا غائب رہ جانے کے نتیجے میں مائتھالوجیز کے قیام کی روایت میں بدل جاتا ہے۔ جس طرح Religious Anthropology کا ایک اصول ہے کہ شرک کو بھی انسانوں کی مذہبیت کے ثبوت کے طور پر دیکھا جائے گا یعنی انسانوں میں مذہب کب سے جاری ہے اگر کسی مرحلے پر ہمیں بت پرستی کا سراغ مل جائے تو یہ مذہبیت کا ویسا ہی علمی ثبوت ہوگا جیسا توحید کا سراغ مل جانے کا ہوسکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شرک ایک Essence of Religiosity سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح Mythology بھی ایک میٹافزیکل Essence ہی کی نمود ہوتی ہے جو وحی کے غائب رہ جانے کی وجہ سے ابھر آتی ہے، چاہے وہ حق پر استوار نہ بھی ہو۔

سوال: کیا سقراط کی شخصیت کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے؟

جواب: ہمیں تین ذرائع سے سقراط کا پتہ چلتا ہے مطلب یہ کہ اس کی شخصیت معرض شک میں نہیں

☆ ناظم شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

☆☆ شعبۂ فلسفہ، جامعہ کراچی

ہے۔ گو ہمارے پاس تفصیلات نہیں ہیں لیکن وہ بہرحال ایک تاریخی شخصیت ہے۔ ہمیں تین ذرائع سے اس کی سوانح اور اس کے بعض افکار کا علم ہوتا ہے صرف افلاطون سے نہیں دو اور ذرائع بھی ہیں۔

۔ ایک چیز رہ نہ جائے وہ نوٹ کر لیں کہ Pythagorian Symbolism اور Platoniac Idealism کو بھی ایک anti-thesis درپیش ہوا جو یونانی ذہن کے مزاج میں تبدیل ہو گیا، چاہے وہ یونانی ذہن کے نظریات میں شامل نہ ہوا ہو لیکن اس کی ساخت اور مزاج میں داخل ہو گیا، وہ ہے Sophism یعنی سوفسطائیت۔ یہ یونانی ذہن کے مزاج میں بہت قوت کے ساتھ موجود ہے چاہے یونانی نظریات کی تشکیل میں صَرف نہ ہوا ہو تو اس Sophism کو بعد میں جدید مغرب کے تصورِ علم نے اپنے استعمال میں لا کے دکھایا۔ اس Sophism کو ضرور ذہن میں رکھیے گا یہ مغربی ذہن کے بہت basic currents میں سے ایک ہے۔

دیکھیں ایک گُر کی بات عرض کرتا ہوں۔ ہر شے، شعور کے موضوع کو فلسفے میں شے کہتے ہیں، کے دو تقدیری modes ہوتے ہیں ایک اس کی معلومیت یعنی میرے شعور میں وہ شے کس طرح ہے اور دوسرے اس کی موجودیت یعنی اپنے وجود میں میرے شعور سے باہر ہو کر وہ شے کس طرح ہے۔ انسانی تہذیب کا سب سے بڑا جوہر یا انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شے کی معلومیت اور موجودیت کے خمیر کو اپنے مسلمات سے تیار کرے۔ جو تہذیبیں شے کی معلومیت اور موجودیت کو متعین کرنے سے عاجز رہ جائیں وہ اپنے وجود کو برقرار تو رکھ سکتی ہیں لیکن کسی جواز کے بغیر۔ بوجھ بھی کندھے پر دھرا رہتا ہے لیکن وہ قوت نہیں ہوتا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے موجود ہونے کے نئے اسالیب اپنے دین کے مادۂ اخلاق اور مادۂ تحقیق سے نہیں نکالے، ہم نے معلوم ہونے کے نئے pattern چیزوں کو ودیعت نہیں کیے۔ ہمارا زوال صرف معاشی اور فوجی نہیں ہے، ہمارا زوال اصل میں علمی اور اخلاقی ہے۔ ہماری مادی کمزوری ہمارے زوال کا سبب نہیں ہے، آپ سوچیے اور اس پر غور کیجیے گا۔ چیز اپنا انداز وجود مجھ سے اخذ کرے۔ چیز اپنا اسلوبِ معلومیت مجھ سے پوچھ کر متعین کرے۔ چیز کی ایک fixed neutralization جس پر مغرب بہت سفاکی کے ساتھ ہمارے لیے اقرار کرتا ہے اور اس پر بڑے بڑے فلسفے بنا کے دکھا رہا ہے۔ یہ جو ایک fixed neutralization ہے وہ ہر object کو انسانی دنیا سے باہر پھینکنے والی قوت کا نام ہے یعنی علم کو مطابق شے ہونا چاہیے۔ یہ ایک فراڈ کیا گیا۔ وحی آئی کس لیے ہے کہ شے کو مطابق علم ہونا چاہیے۔

شے کی تقدیر علمی یہ ہے کہ وہ اللہ کی نشانی بنے۔ شے اپنی physical properties میں کون سی اللہ کی نشانی ہے۔ اللہ مجھے پابند کر رہا ہے کہ میں شے کو اس کے وجودی perspective، اس کے وجودی جواز، اس کی صورت معلومیت پر کام کروں، اس کو اللہ کی نشانی کے موقف پر رکھوں، اپنے شعور میں بھی اور اس کے وجود میں بھی یہ شے پر تصرف نہیں ہے۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، افسوس کچھ بھی نہ کر سکے۔ خود ہی اللہ کی نشانی بن کر نہیں رہے تو دوسروں کو کیا اللہ کی نشانی بنائیں گے۔

صفاء انسٹی ٹیوٹ میں فکری نشست

سید خالد جامعی ☆

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری☆☆

مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج

سید خالد جامعی

مسلم معاشرے کے لیے مغربی تہذیب کا جو چیلنج ہے اور اس نے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کی ایک ترجمانی 'خطبات اقبال' کے ذریعے ہوئی۔ اور خطبات اقبال کے بارے میں سلیم احمد کا قول ہے جو سہیل عمر صاحب کی کتاب 'خطبات اقبال ۔ نئے تناظر میں' میں بھی درج ہے کہ اگر ہم مغرب سے پیپسی اور کوٹ پتلون کے علاوہ کچھ اور بھی سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے 'خطبات اقبال' ہماری رہنمائی کرتا ہے اور 'خطبات اقبال' عہد حاضر کی انجیل ہے۔ 'خطبات اقبال' میں مغربی تہذیب سے درپیش چیلنج کا جو جواب دیا گیا تھا میرے خیال میں کم وبیش سو سال کے عرصے میں عالم اسلام کے مفکرین کی جانب سے وہی حل پیش ہوتا رہا ہے خواہ وہ مفتی محمد عبدہ ہوں، جمال الدین افغانی ہوں، سر سید احمد خاں ہوں، چراغ علی ہوں، خواہ وہ آپ کے وحید الدین خاں ہوں، خواہ وہ جاوید احمد غامدی ہوں، خواہ وہ یوسف قرضاوی ہوں، بلکہ جو راسخ العقیدہ علما ہیں اور راسخ العقیدہ مکاتب فکر ہیں ان کی جانب سے بھی ایک ہی جواب دیا گیا ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا چیلنج سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اور عالم اسلام اس وقت تک مغرب کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا جب تک کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل نہیں کرتا۔

یہ وہ حل ہے جو مشترکہ طور پر راسخ العقیدہ اور لبرل اسلامک ماڈرنسٹ لوگوں کے اندر ایک عموم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کا جو حل بیان کیا گیا گزشتہ سو سال کے عرصے میں وہ ایک ہی حل تھا اور اس کا جو تناظر تھا وہ بھی ایک ہی تناظر تھا اور وہ تناظر یہ تھا کہ چونکہ عالم اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی

کے میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گیا ہے لہٰذا مغرب نے اپنی عسکری یلغار سے عالم اسلام کو مغلوب کر لیا ہے لہٰذا اگر عالم اسلام کو غالب آنا ہے تو اسے وہ ہتھیار، وہ سائنس اور وہ ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہوگی جس کے ذریعے مغرب کو ہم پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ مشترکہ حل ہے جو ہر شخص کی طرف سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ، استدلال کے حسن اور لطافت و نزاکت کے ساتھ، اپنے اپنے استعارات اور محاوروں میں پیش کیا گیا ہے لیکن حل یہی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا عروج ہوگا تو وہ کہتے ہیں کہ جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہوگا۔ تو اجتہاد سے ان کی مراد ہوتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی جبکہ اسلامی تہذیب اور اسلامی روایت میں اجتہاد کا مطلب سائنس اور ٹیکنالوجی کبھی ہمارے ہاں نہیں لیا گیا۔ بنیادی استدلال یہ ہے کہ سترھویں صدی میں مغرب دنیا بھر میں اپنے جونو آبادیات قائم کرتا چلا گیا تو اس کے پاس وہ ہتھیار اور وہ ٹیکنالوجی تھی جو عالم اسلام کے پاس نہیں تھی اس لیے عالم اسلام کو شکست ہوگئی۔ یہ عمومی مقدمہ ہے جو تمام اکابر کے ہاں ہمیں ملتا ہے۔

عبد الوہاب سوری صاحب اپنے پوسٹ ڈاکٹریٹ تھیسز کے لیے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں اس لیے میں خاص طور پر انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں اور انہوں نے اس پر کام بھی کیا ہے لہٰذا یہ اس پر تفصیل سے کلام کریں گے۔ ویسے تقریباً تین سال سے ہم اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں اور ہم نے تقریباً تین ہزار صفحات اس پر مرتب کیے ہیں جو آپ کی خدمت میں ان شاء اللہ اگلے چند ماہ میں پیش کر دیئے جائیں گے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ جب مغرب نے ہندوستان پر یلغار کی یا وہ عرب پر حملہ آور ہوا یا ترکی پر حملہ آور ہوا تو کیا عالم اسلام کی حکومتوں کے پاس یا خلافت عثمانیہ کے پاس یا مغلیہ سلطنت کے پاس ہتھیار اور اسلحہ ان سے کم تر تھا؟ یہ ہے بنیادی مقدمہ۔ اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے تو ان مفکرین کا جو حل ہے وہ آدھے سچ کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے پورے تھیسز کے طور پر پھر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس کا جواب عبد الوہاب سوری صاحب دیں گے۔ کچھ سوال میں اور بھی پیش کرتا ہوں جن کا جواب سوری صاحب دیں گے اور ان جوابات میں بھی انشاء اللہ ایک ادراک، ایک فہم، تاریخ، تہذیب اور ایک حقیقت اپنا چہرہ کھولتی نظر آئے گی۔

مثال کے طور پر اگر اس مقدمے کو ٹھیک تسلیم کر لیا جائے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ جب تاتاریوں

نے عباسی حکومت پر یلغار کی جو اس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پاس بیت الحکمت بھی تھا جس میں اٹھائیس زبانوں میں ترجمے کی صلاحیت تھی اور عباسی خلفا کے دربار میں مناظرے بھی ہوتے تھے علم پر، منطق پر، اور فلسفے پر تو عباسیوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں اور تاتاریوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں تو پھر تاتاریوں نے عباسیوں کو شکست کیوں کر دے دی؟ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ عباسیوں نے یا عالم اسلام نے تاتاریوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا انہوں نے ہتھیاروں کے بل پر کیا تھا؟ کیا انہوں نے ایٹم بم ایجاد کر لیا تھا جو انہوں نے تاتاریوں پر پھینک کر غلبہ حاصل کر لیا؟ نہیں! بلکہ ایسا عالم اسلام نے اپنی علمیت، اپنی علمی قوت اور اپنے دین کے آفاقی پیغام کے ذریعے کیا۔ اور وہ آفاقی پیغام بلا شک و شبہ آج بھی اتنی ہی قوت رکھتا ہے جتنی قوت وہ تاتاریوں کی یلغار کے زمانے میں رکھتا تھا۔ تو عباسیوں نے جو دوبارہ فتح حاصل کی وہ تلوار کے ذریعے، ایٹم بم کے ذریعے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل نہیں کی بلکہ انہوں نے تاتاریوں کو مسلمان کر لیا اور یوں ان کو شکست دے دی۔ عسکری میدان میں شکست کھانے کے باوجود ان کو علم کے میدان میں شکست دے دی۔

تہذیبوں اور قوموں کا مقابلہ اکثر علم کے میدان میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کی تہذیب کی علمی برتری قائم ہے، اگر آپ کا علم آفاقی ہے، اگر اس علم کے اندر کوئی قوت، کوئی تاثیر اور کوئی خوبی موجود ہے تو وہ آج بھی مغرب کو شکست دینے کے لیے کافی ہے اور اگر عسکری میدان میں ایک دو بار کی شکست ہو بھی جائے تو اس سے تہذیب کی قوت پر اور اس کی علمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے لیے دو مثالیں اور میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ایک مثال فاطمیوں کی حکومت کی ہے۔ فاطمیوں نے آ کر عباسی خلافت پر قبضہ کر لیا۔ عباسیوں نے تین مرتبہ اپنی خلافت چھیننے کی کوشش کی لیکن فاطمیوں کو شکست نہیں دے سکے اور 274 سال مصر پر فاطمیوں کا قبضہ رہا۔ یوں مصر پر عباسی سلطنت کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ تلوار کے ذریعے نہیں ہوا، وہ کسی ایٹم بم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں ہوا وہ صلاح الدین ایوبی کے ذریعے ہوا۔ صلاح الدین ایوبی نے فاطمیین مصر کو جو ایک لڑکھڑاتی اور سسکتی ہوئی تہذیب کے نمائندے بن گئے تھے، ان کو اپنی فطری موت مرنے دیا اور جیسے ہی آخری فاطمی خلیفہ مرا، سلطان صلاح الدین ایوبی نے

عباسیوں کا خطبہ جاری کر دیا، بغیر خون خرابے کے خلافت اسلامیہ ایک بار پھر اوج پر آ گئی۔

دوسری مثال میں آپ کے سامنے اندلس کی پیش کرتا ہوں جسے آج کل ہم اسلامی دنیا میں ایک رول ماڈل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اب تو اسلام آباد میں قرطبہ کے نام سے ایک شہر بھی بن رہا ہے۔ غالباً نیا قرطبہ بنانے والوں کو پرانا قرطبہ بنانے والوں کا انجام یاد نہیں رہا۔ اسلامی تہذیب میں یہ کوئی آئیڈیل نہیں ہے یہ زوال کی آخری علامت ہے جس کو آپ عروج کے طور پر اسلام آباد کے اندر پیش کر رہے ہیں۔ علمی وفکری افلاس اِس وقت عالم اسلام کا عمومی مسئلہ ہے۔ مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے اندلس کے اندر، اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی بات نہیں ہے۔ برٹرنڈ رسل نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ جس وقت اندلس کی سڑکوں پر چراغ جلتے تھے اس وقت پیرس کی گلیوں میں کیچڑ اور اندھیرا ہوتا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت اندلس میں کتابوں کی 326 دکانیں تھیں جبکہ اس وقت پورے یورپ میں کتابوں کی صرف 13 دکانیں تھیں اور اندلس میں علم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک عالم کتابوں کی دکان پر کتاب خریدنے کے لیے پہنچا اور اس نے کتاب کے دام لگائے تو اس کے برابر کھڑے ہوئے ایک شخص نے اس سے بھی زیادہ دام لگائے، اُس نے اِس سے زیادہ دام لگائے تو اُس شخص نے اِس سے زیادہ دام لگا دیے حتیٰ کہ وہ کتاب اُس آدمی نے خرید لی۔ عالم اس سے بڑا متاثر ہوا کہ شاید یہ مجھ سے بھی بڑا عالم ہے جسے اس کتاب کی ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا: حضرت! آپ کا شوق کیا ہے، مشاغل کیا ہیں؟ اس نے کہا: میں قصائی ہوں، عالم نے کہا: آپ یہ پڑھتے ہیں کیا؟ قصائی نے کہا: مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب قومیں کتابیں جمع کرتی ہیں تو تاریخ کے دفتر کے اندر خود بھی جمع ہو جاتی ہیں۔ اس پر مزید گفتگو کے لیے میں عبد الوہاب سوری صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مقدمے کو آگے بڑھائیں۔

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری

سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے جب عمومی بحث ہوتی ہے تو اس میں جو دو تین بنیادی تصورات اور مفروضے (fundamental presumptions) زیر بحث آتے ہیں پہلے ہم ان کو identify کر لیتے ہیں اور یہی وہ تصورات ہیں جو ہمارے بڑے بھی ہمیں دیتے آئے ہیں

اور ہم ان سے سنتے بھی رہے ہیں۔ پہلا تصور ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ کہ سائنس و ٹیکنالوجی دونوں کو باہم مترادف سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سائنس کی application اس طرح سے آپ کی عملی زندگی میں ہو کہ اس کے ذریعے آپ کے سرمائے میں اضافہ ہو تو اسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں:

Technology is derived from the application of scientific laws for the maximisation of capital accumulatioin otherwise technology will never transfer to the common people

کوئی بھی سائنٹفک لاء جب اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو زندگی کے کسی دائرے پر اپلائی کر کے ایک ایسی چیز بنائی جا سکے جس پر جتنا پیسہ خرچ کیا جا رہا ہو اس سے زیادہ پیسہ وصول ہو سکے تب وہ ٹیکنالوجی کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے ورنہ اگر اس کی لاگت (cost) زیادہ ہو چاہے وہ جتنی بھی اہم ہو وہ آپ کے گھر تک نہیں پہنچے گی کیونکہ اس کی cost بڑھ جائے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹیکنالوجی کا کیپٹل ازم سے ایک خاص نوع کا تعلق ہے۔ جس پر ہم آئندہ بات کریں گے۔ اس وقت ہم یہ کہہ رہے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ ہر سائنس ٹیکنالوجی میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتی۔ سائنس کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ ہر سائنٹفک تھیوری ٹیکنالوجی میں تبدیل نہیں ہو سکتی جیسے مثلاً راکٹ سازی سائنس کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری presumption یہ ہے کہ ٹیکنالوجی بذاتِ خود ویلیو نیوٹرل ہوتی ہے یعنی ٹیکنالوجی کی اپنی کوئی ویلیو نہیں ہوتی بلکہ آپ اس میں جو ویلیو داخل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں مثلاً موبائل فون ٹیکنالوجی ہے اور اس کی اپنی کوئی قدر نہیں ہے۔ اسے میں اپنے بزرگوں سے بات کرنے کے لیے استعمال کروں یا اسے میں جوائنٹ سٹاک مارکیٹ میں پیسہ لگانے کے لیے استعمال کروں۔ کس مقصد کے لیے استعمال کروں اس کا تعین مَیں خود کروں گا یہ چیز نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ بچپن سے ہم سکول سے سنتے آئے ہیں کہ تلوار ایک ہتھیار، ایک ٹیکنالوجی ہے جس سے آپ اپنی گردن بھی کاٹ سکتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔ اب یہ تلوار چلانے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر چلاتا ہے یا کسی دوسرے کی گردن پر۔ ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ دوسری presumption ہے کہ یہ اپنی کوئی

ویلیو نہیں رکھتی، ویلیو نیوٹرل ہے۔ اس کے اندر ہر معاشرہ اور ہر تہذیب اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والا اپنی ویلیو داخل کر سکتا ہے۔ یورپین معاشرہ اگر یہ ٹیکنالوجی استعمال کر رہا ہے تو وہ اس میں اپنی ویلیوز داخل کر سکتا ہے اور اگر کوئی مسلمان وہ ٹیکنالوجی استعمال کرے گا تو وہ اس میں اپنی ویلیو نہ داخل کر سکے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں presumptions غلط ہیں۔ اور یہ میں آپ کو کوئی اطلاع نہیں دے رہا اور نہ یہ محض میری ذاتی رائے ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو ٹیکنالوجی کے فیلڈ میں اتھارٹی ہیں اور دنیا کے مشہور آدمی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے ایلول جس نے ٹیکنالوجی پر بہت لکھا ہے۔ ان میں سے ایک ہوزے ماریس ایکرڈ ہے جو ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ ان میں سے ایس پرویز منظور بھی ہے Islamisation of knowledge کا آدمی ہے لیکن یہ مشہور مصنف ہے جس کی ٹیکنالوجی موضوع پر کئی اہم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور آدمی ہے جس کا نام چارس ٹلی ہے جس کا ٹیکنالوجی پر زبردست کام ہے۔

ان سب کا اس بات پر اجماع ہے حالانکہ یہ مختلف مکاتب فکر کے آدمی ہیں، ان میں کوئی leftist ہے، کوئی قدامت پسند مسلمان ہے، کوئی لبرل ٹائپ کا انسان ہے، چارس ٹلی سوشل ڈیموکریٹ ہے۔ ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اپنی ویلیوز لے کر آتی ہے۔ ہر ٹیکنالوجی کی اپنی ویلیوز اس کے اندر in built ہوتی ہیں۔ گویا کہ Technology is inchangably value ridden۔ دوسری بات یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ہم اپنے لیکچر میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کو refute کریں ہم ایک دو معروضات پیشگی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ نئی ٹیکنالوجیز متعارف ہونے کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے مثلاً انیسویں صدی میں پچاس سال کا آدمی اپنی پوری زندگی میں دو یا تین نئی ٹیکنالوجیز سے متمتع ہوتا تھا، دو یا تین ٹیکنالوجیز کو سیکھنے میں ہی اس کی عمر گزر جاتی تھی اور وہ انتقال کر جاتا تھا جبکہ عصر حاضر میں پچاس سال کا آدمی تیس ٹیکنالوجیز اپنی زندگی میں متعارف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور چارلس ٹلی کا خیال ہے کہ ابھی اس کی رفتار میں اور زیادہ تیزی آئے گی۔ خصوصاً یہ نوٹ کیجیے کہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد تبدیلی کتنی زیادہ اور کتنی تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔

اٹھارویں صدی تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ پوری انسانیت مل کر جو علم تخلیق کرتی ہے وہ اگلے تین سو سال میں دوگنا ہوجاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ اگر سترھویں صدی میں پوری انسانیت نے مل کر جو علم تخلیق کیا وہ 10 یونٹ تھا تو اس کو دوگنا ہونے کے لیے مزید 3 سو سال درکار تھے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد یہ 3 سو سال چار گھنٹوں کے برابر ہوگئے ہیں۔ اب علم اتنی تیزی سے تخلیق کیا جارہا ہے کہ وہ ہر چار گھنٹے بعد دوگنا ہوجاتا ہے ہم دوپہر کا کھانا کھا کر چلے تھے اور یہاں پہنچے ہیں تو اس وقت تک علم کی مقدار دوگنا ہوچکی ہے کیونکہ چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کی رفتار اتنی تیز کیوں ہوگئی ہے؟ اس کا ایک جواب عام طور پر لوگ یہ دیتے ہیں کہ لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں۔ لوگ ذہین ہو گئے ہیں۔ تو کیا اچانک ذہین ہو گئے ہیں؟ لوگوں کی ذہانت تو ہر دور میں رہی ہے ابن سینا کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک لائبریری کا انچارج تھا۔ لائبریری میں آگ لگ گئی اور کتابیں جل گئیں۔ خلیفہ وہاں آتا تھا کتابیں پڑھنے لوگ ڈر گئے کہ خلیفہ آیا اور کتابیں نہ ہوئیں تو وہ ناراض ہوگا۔ ابن سینا نے کہا: کوئی بات نہیں کاغذ قلم لاؤ اور اس نے وہ 5 سو کتابیں دوبارہ مرتب کر دیں تو یہ عالم تھا ابن سینا کی ذہانت کا۔

آج کے دور کا انسان اتنا ذہین ہو گیا ہے کہ وہ ہر لمحے ایک نئی ٹیکنالوجی تخلیق کر رہا ہے تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارا طرز عمل کیا ہو؟ اس وقت ہم اسلام وغیرہ کی باتیں بالکل نظری سطح پر کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کے کون کون سے ماڈل دنیا میں روبہ عمل ہیں اور امت مسلمہ اگر امریکہ اور یورپ کو شکست دینا چاہتی ہے تو وہ کون سے ماڈل کو اپنائے؟

بیسویں صدی میں ٹیکنالوجی کی ترقی کے دو ماڈل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ماڈل ہے leftists شوشل ماڈل جو کمیونسٹ دنیا نے استعمال کیا اور دوسرا ماڈل وہ ہے جو مغرب کے سرمایہ دارانہ لبرل نظام کے اندر استعمال کیا گیا۔ دونوں کی اپنی اپنی انفرادیت اور حاصلات ہیں۔ پہلے ہم لیتی لیفٹ کے ماڈل کو۔ لیفٹسٹوں کی سائنس کے ساتھ کمٹمنٹ اتنی زیادہ تھی کہ مارکس اپنے آپ کو فلسفی نہیں کہتا تھا بلکہ کہتا تھا کہ ہم سائنس دان ہیں۔ تو جتنے بھی لیفٹسٹ ہوئے ہیں مارکس کے بعد لینن، سٹالن یا ویت نامی اور کیوبا والے تو ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو مذہب کے متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ مذہب کو افیون کہتے تھے اور سائنس و ٹیکنالوجی کو ترقی کی واحد اساس سمجھتے

تھے۔

سائنس وٹیکنالوجی کے ساتھ کمیونسٹوں کی کمٹمنٹ تھی اور اس کمٹمنٹ کی یہ حالت تھی کہ سٹالن نے ایک ہی دن میں اٹھارہ پادریوں کے گلے پر چھری پھیری تھی حالانکہ وہ انقلابی بننے سے پہلے خود پادری تھا۔ تو سٹالن کہتا ہے کہ مذہب تو مسائل کی جڑ ہے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا چاہیے تا کہ لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں اوران کا معیار زندگی بلند ہوسکے (جاری ہے)۔

عبدالرشید ارشد

مغربی تہذیب سے مرعوبیت کیوں؟

سطحی علم اور سطحی سوچ رکھنے والوں کو، خواہ اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں اُن کی جھولی میں ہوں، ہر چمکدار چیز سونا نظر آتی ہے۔ پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے کہ ''پرائی کھُرلی دے ٹنڈے مٹھے لگ دے نیں'' یعنی مویشیوں تک کی نفسیات یہ ہے کہ اپنے سامنے مہنگی کھل بنولہ بھی کیوں نہ پڑی ہو دوسرے مویشی کے سامنے پڑے خشک چارے میں منہ ضرور ماریں گے۔ یہی حال انسانوں کا ہے کہ دوسرے کی بیوی یا بیوی کو دوسروں کے شوہروں میں خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اپنا میاں اور اپنی بیوی بس ''مجبوری'' ہی رہتی ہے۔

مذکورہ سطور ہم نے اس لیے بطور تمہید لکھی ہیں کہ ماہنامہ ''البرہان'' کے تازہ شمارہ میں دو محترم مصنفین کی تحریریں ''مسلم ترقی کے لیے مغربی سائنس وٹیکنالوجی ناگزیر ہے'' (حمیرا رانا) اور ''مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں'' (سہیل احمد) سامنے آئیں جو مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوبیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مغربی تہذیب وتمدن کا دور سے 'مطالعہ' یا 'مشاہدہ' ایسے خیالات کو جنم دیتا ہے جبکہ اس تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور چکھنے والوں کا نکتہ نظر اس کے برعکس ہے مثلاً علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور بانئ پاکستان محمد علی جناح برسوں یورپ میں بغرضِ تعلیم مقیم رہے اور تہذیب مغرب انہیں مرعوب نہ کرسکی۔

؎ تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت

؎ نظر کو خیرہ کرتی ہے تہذیب یورپ کی مگر یہ جھوٹے نگینوں کی ملمع سازی ہے

؎ یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

مختصراً یہ علامہ اقبالؒ کا تہذیب کے حوالے سے یا مسلمانوں کی تہذیب مغرب سے مرعوبیت کے نقطۂ نظر سے فرمان ہے۔ تہذیبِ مغرب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب وتمدن ہے اس پر قائداعظمؒ کا فرمان یا نکتہ نظر بھی ملاحظہ فرمائیے جو ان کے علم اور قرآن حکیم اور شریعت حقّہ پر محکم ایمان کا اعلان بھی ہے۔

''مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی کا تصور یہ ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو معرض وجود میں لائے جو قرآن کے ضابطہ خداوندی کی متشکل ہو۔۔۔مسلمان کے نزدیک ہر وہ نظام باطل ہے جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو کیونکہ اس کے پاس ایک محکم دستور ہے جو اس کی ہر موقع اور ہر زمانہ میں راہنمائی کرسکتا ہے۔''

''۔۔۔لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا محدود اور مقید مفہوم و تصور نہیں ہے۔ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی وسماجی ہو یا معاشی، غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔۔۔'' (حیات قائداعظم، از چودھری سردار محمد خان عزیز، ص ۲۵۵)

تہذیب وتمدن کیا ہے؟ معاشرتی وسماجی، سیاسی و معاشی اقدار کے مجموعے کا نام ہی تو تہذیب وتمدن ہے۔ اسلام واحد مذہب ہے جس نے ان پہلوؤں میں اعلیٰ اقدار کو متعارف کراتے ہوئے مثالی تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی۔ تاریخ عالم نے پہلا مثالی معاشرہ تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل دیکھا یہاں تک کہ مسلمان فاتح جس جس ملک میں گئے وہاں یہ تہذیب متعارف ہوئی تو غیر مسلم اس کے گرویدہ ہوگئے۔ عملی زندگی کے ہر میدان میں اس تہذیب نے مثالی کارہائے نمایاں سرانجام دیے مثلاً سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں، علم وادب کے میدان میں غرض کوئی شعبہ زندگی خالی یا ادھورا نہ رہا اور مغرب نے یہیں سے خوشہ چینی کرکے سب کچھ لیا۔ جب اور جہاں مسلمان اپنی اصل سے جس قدر دور ہوئے تہذیب وتمدن کی ڈور ڈھیلی ہوتی چلی گئی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصل (قرآن) کی جھولی خالی ہوگئی تھی۔ لینے والوں کا ظرف ہمت ہارتا رہا، اور مسلمان کہلوانے

والے بے ہمتی کا مظاہر کرتے کرتے خود خوشہ چین بن گئے۔

حمیرا رانا کا نکتہ ہمارے نزدیک اپنے ''سرمایہ'' کی حقیقت کو نہ جاننا اور تہذیب مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہونا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اُن کا فرمان:

''۔۔۔اگر ہم مغربی تہذیب کے تعلیمی نظام کو، جو آج کل ہر طرف چھایا ہوا ہے چھوڑ دیں تو ہم ترقی نہیں کر سکتے اور ان کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم سائنسی، سیاسی، معاشی ہر میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ آج کل کی جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت افادیت رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تہذیب پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے'' (البرھان، ص ۴۶)

حمیرا رانا مذکورہ نکتہ نظر کو ان الفاظ کے ساتھ سمیٹتی ہیں ''اس لیے ہمیں دنیا میں ترقی کے لیے مغربی تہذیب کے طور و اطوار کو اپنانا ہوگا تاکہ ہم بھی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوں اور جدید سہولیات سے فائدہ اٹھائیں''

مغربی نظام تعلیم ماضی کی نسبت آج بہت زیادہ بگاڑ کا باعث ہے۔ کم و بیش ۶۰، ۶۵ سال قبل علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ لارڈ میکالے کی ذریت ہماری تعلیم کو جدید خطوط پر جو جہت دینا چاہتی ہے اس کا مقصد ہے ؎

اک لُرد ِفرنگی نے کہا اپنے پسر سے　　منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر!
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

لارڈ میکالے نے جو مغربی نظام تعلیم غیر منقسم ہندوستان میں متعارف کرایا تھا اور جس سے ہند و پاک میں گندمی رنگ کی نسل علم کی وارث بنی۔ اس کے کھلائے گُل آج جو بہار دکھا رہے ہیں وہ ہر باشعور کے سامنے ہے۔ صدی کا سفر طے کرتے آج یورپی علم جہاں پہنچ چکا ہے وہ مسلمان قوم کی تباہی کا مکمل سامان سمیٹے ہوئے ہے۔ مخلوط تعلیمی درسگاہیں مغرب کی نسل کو جہاں لے آئی ہیں حمیرا رانا انتہائی خیر خواہی سے اہل وطن کو بھی وہاں پہنچانا چاہتی ہیں مگر ایک یورپی دانشور کا نکتہ نظر دیکھیے:

''۔۔۔انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی مثال بھی اس قسم کی نہیں ملتی کہ کوئی ایسی

سوسائٹی تہذیب تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو، جس کی لڑکیوں کی پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہو جس میں مرد و زن مخلوط رہے ہوں۔ تاریخ عالم میں کوئی بھی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ وہ قوم اپنی تہذیبی و تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ اس کے برعکس صرف وہی اقوام تہذیب کی انتہائی بلندیوں کو پہنچ سکی ہیں جنہوں نے مخلوط میل جول پر پابندی عائد کی''

''۔۔۔کوئی قوم کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتی ہو، اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی، اس بات کا انحصار صرف ان حالات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی و حال میں مرد اور عورت کے میل جول کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب اور نافذ کر رکھے تھے''

''اگر کسی قوم کی تاریخ آپ دیکھیں کہ کس وقت اس کی تمدنی سطح بلند تھی یا پست تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے مرد و زن کے تعلقات میں کیا تبدیلی کی تھی جس کے نتیجے میں اس کی سطح بلند تھی یا پست''(Sex and Culture, Dr. J. Unwin, Cambridge University)

حمیرا رانا کا یہ خیال کہ ''آج کل جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے بہت افادیت رکھتی ہیں ہم ان کی تہذیب پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے'' دراصل حمیرا رانا کا مذکورہ نکتہ نظر اسلام کے نظام تہذیب و تمدن اور نظام معیشت کو نہ سمجھنے کے سبب ہے۔ کسی بھی باشعور سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ کسی بھی چیز کا موجد اپنی ایجاد کے ضمن میں اتھارٹی تسلیم کیا جائے گا یا اس کے مدِّ مقابل کوئی دوسرا اتھارٹی ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے سچا تسلیم کر لیا جائے گا۔ عقل و دانش موجد کو ہی اتھارٹی تسلیم کرے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا، اس کے اندر موجود ہر نوع کی مخلوق کا منصوبہ ساز اور موجد ہے۔ اسے اپنی ''ایجاد'' کے ہر ہر پرزے کی کارکردگی، اس کی ضروریات کا مکمل ادراک ہے۔ اس نے اپنی ایجاد کو مؤثر بنانے کے لیے ہدایات کی مکمل و مدلل کتاب نازل فرمائی جس میں تہذیب و تمدن، معاش و معیشت، عدل و اصولِ حکمرانی غرض ہر شعبہ

پر راہنمائی دی ہے۔

''موجد'' کی ہدایات پر تو عمل نہ کیا جائے اور خود اِدھر اِدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے، گردوپیش سے کچے پکے طور طریقوں کی نقالی سے کامیابی کی منزل پانے کا عزم محض عزم تو ہوسکتا ہے حقیقی منزل تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ آج یورپ تو اسلام کے نظام معیشت کی طرف پلٹنے کی کوشش کررہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بے شمار مغربی بنکوں میں اسلامی بنکاری کے کاؤنٹر کھل رہے ہیں۔ معاشی پالیسیوں کی اصلاح کی کوشش ہورہی ہے اور جن کی جھولی میں پارس پتھر ہے وہ جھوٹے نگینوں کے لیے بے تاب ہیں۔ اپنے اصل سے انحراف نے ہمیں سوچ کے اس انداز تک پہنچایا ہے۔

مغربی تہذیب وتمدن کے دلدادہ سہیل احمد صاحب کا نکتہ نظر بھی حمیرا رانا سے مختلف نہیں بلکہ ان کی سوچ ان سے بھی چند قدم آگے ہے۔ ان کے نزدیک ''مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں'' ان کا یہ فرمان کہ: ''تہذیب نتیجہ ہوتی ہے انسانی رویوں کا اور ایک کامیاب تہذیب کا مطلب ہی ترقی ہوتا ہے کیونکہ وہ نتیجہ ہوتی ہے ترقی کے لیے پیدا کردہ مناسب ماحول کا'' قابل توجہ ہے۔ ان کی اس سوچ کی نفی مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں کے بیانات ہیں خصوصاً اسلام کے دامن میں آنے والے مردوں اور عورتوں کے:

''۔۔۔مغرب کے لوگ اپنی سوسائٹی سے مایوس ہورہے ہیں جس میں بڑھتے ہوئے جرائم، خاندانی نظام کی تباہی، منشیات وشراب نوشی کا دور دورہ ہے۔ بالآخر وہ اسلام کے دیے ہوئے نظم وضبط اور تحفظ کی تعریف کرتے ہیں''۔

''برطانیہ کی نومسلم خواتین نے ہمیں بتایا کہ اسلام میں ہمارے لیے کشش کا سبب ہی یہ ہوا کہ اسلام مردوزن دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار تجویز کرتا ہے جو دونوں کی جسمانی ساخت کے عین مطابق ہے'' (Daily Times London, Nov 9, 1993, A Survey Report

"Why Europion women embrace Islam?)

سہیل احمد صاحب کے نزدیک ترقی کی راہ میں رکاوٹ ''مغرب کی طرح انقلابی تبدیلیوں کو قبول نہ کرنا'' اور عورت کا پردہ کرنا ہے۔ مغرب نے انقلابی تبدیلیوں کو ''قبول'' کرلیا اور پردہ سے جان

چھڑالی اور آج یورپ ترقی کی معراج انجوائے کررہا ہے۔ ترقی کی تعریف ہر کسی کے نزدیک مختلف ہے مثلاً ''یورپی ترقی،، جنسی آزادی اور ہم جنس پرستی کی قانونی حیثیت ہے۔ کیا مسلم معاشرے کو اسے قبول کرکے ترقی حاصل کرلینی چاہیے؟ یورپی معاشرہ مادر پدر آزاد معاشرہ ہے۔ کیا اسلام ایسے معاشرے کی اجازت دیتا ہے؟ اسلام کا اپنا ضابطہ اخلاق ہے، ضابطہ معاش ومعیشت ہے، ضابطہ عدل وحکمرانی ہے۔

فاضل مضمون نگار ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ قرآن حکیم کو یقینا کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس قرآن کا آغاز الحمد للہ رب العالمین، الرحمن الرحیم سے ہوتا ہے۔ رب کے معنی پرورش کنندہ ہے۔ والد اپنے کنبہ کی پرورش کرتا ہے تو صرف کھانا دینا، صرف لباس دینا یا صرف کسی ایک پہلو کو پیش نظر رکھنا پرورش نہیں کہلاتا۔ پرورش کے لوازم ہمہ جہت ہیں۔ اور ان کی تکمیل کے لیے محبت وشفقت اور جذبہ رحم ضروری ہے جس سے خالق نے مخلوق کو نوازا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو اولاد کی پرورش میں خیر و شر کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتا ہے۔

خالق مخلوق کا پرورش کنندہ ہے اور رحمن ورحیم ہے یعنی لازوال رحم وشفقت اس کی صفت ہے۔ اس خالق نے اپنی احسن تخلیق شدہ جنس انسانی کے لیے جو ضوابط مقرر کیے وہ غیر حکیمانہ اور نقصان دہ کیسے تسلیم کرلیے جائیں کہ ہر تقاضے کی تہ میں حکمت اور خیر خواہی ہے مثلاً سماجی ومعاشرتی زندگی میں عورت کے لیے حدودِ ستر (پردہ) کا اہتمام، معاش ومعیشت کو سودی لعنت سے محفوظ رکھنا، نظام تعلیم و تربیت کو قرآن وسنت کے تابع رکھنا وغیرہ۔ ان امور کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ مسلمان کو ترقی کرتا دیکھنا پسند نہیں کرتا، اسے کافر کی ترقی پسند ہے۔

جہاں تک فنی اور سائنسی ترقی کا تعلق ہے مسلمان انجنیئر، ڈاکٹر، زرعی صنعتی ماہرین اور سائنس دان انتہائی باصلاحیت ہیں۔ خود یورپ وامریکہ ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کررہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ ویورپ کے پاس سرمایہ یہود کا اور صلاحیتیں غیر امریکی وغیر یورپی ماہرین فن کی زیادہ ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی محسن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو کہاں سے کھینچ کر لایا گیا تھا۔ تحقیقی لیبارٹری کہوٹہ کی ہو یا پی سی ایس آئی آر ہو یا ایوب ریسرچ انسٹیٹیوٹ ہو ہر جگہ باصلاحیت لوگ صبح شام

مصروف عمل ہیں۔ یہ صلاحیتیں قوم کے سامنے اس لیے نہیں آتیں کہ بعض مؤثر غیبی ہاتھ ایسے کسی تحقیقی کام کو سامنے آنے نہیں دیتے کیونکہ ان کا مفاد بھارت سے، امریکہ و یورپ سے ''ترقی'' اور ''ترقی یافتہ'' درآمد کرنے سے مشروط ہے۔ چونکہ قوم کے سامنے تصویر کا ایک ہی رُخ ہے اس لیے سہیل احمد صاحب اور دوسروں کو ترقی نظر نہیں آتی ؎

اغیار سے ڈھونڈتے پھرتے ہیں مٹی کے چراغ　　اپنے خورشید پہ پھیلائے ہیں سائے ہم نے

محمد انور عباسی

سائنس وٹیکنالوجی اور مسلم ترقی

البرہان کے شمارہ فروری و مارچ میں درج بالا موضوع پر ڈاکٹر نعمان ندوی صاحب کی تحریر پڑھ کر جہاں یہ اندازہ ہوا کہ سائنس وٹیکنالوجی اسلام کے لیے کتنی خطرناک ہے وہاں بہتوں کی جنرل نالج میں بھی اضافہ ہوا ہوگا کہ جزیرۃ العرب کی سرزمین مرکز کائنات ہے۔ گلیلیو کے دور میں پادری حضرات بھی اسی قسم کے ایمانیات کا پرچار کرتے تھے۔ گلیلیو نے آکر زمین کو مرکزِ کائنات کے چکر سے نکالا تاہم اتنے ماہ وسال گزرنے کے بعد ندوی صاحب محترم نے پھر سے نہ صرف زمین کو بلکہ زمین میں سے بھی جزیرۃ العرب کی سرزمین کو مرکزِ کائنات بنا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مرکز کائنات کو جاہل و ان پڑھ قسم کی قوم کا مسکن بھی قرار دے دیا اور بھول گئے کہ یہ ان پڑھ قوم کس قدر اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق رکھتی تھی۔ کعبہ کی دیوار پر اپنے اشعار کس طرح لٹکا لیتی تھی۔ اس دور کے مشہور سبعہ معلقات ان پڑھ و جاہل قوم سے کیونکر اور کس طرح سرزد ہو گئے تھے؟

ڈاکٹر صاحب محترم! اس قوم کو امی اس لیے نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ ان پڑھ تھے بلکہ اس لیے کہ اس میں الہامی کتاب کا وجود نہ تھا۔ وہ تو اپنے علاوہ ہر قوم کو گونگا گردانتے تھے۔ امّی کا مطلب جاہل لینا بڑا ہی عجیب ہے اور یہ دعویٰ تو عجیب تر ہے کہ 'انیسوی صدی کے آخر تک مکہ معظّمہ میں فراہمی

آب ونکاسی فضلات کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا،صحرائی وریگستانی ماحول کے بدویانہ طرزِ زندگی میں اس طرح کی جدید سہولیات کی عدم موجودگی کو ہم سائنسی علوم کے غیر اہم ہونے پر دلیل قائم کر رہے ہیں حالانکہ بالکل ابتدائی دور میں حضرت عائشہؓ کا بیان قابل غور ہے جو آپ نے واقعہ افک کی تفصیلات بتاتے ہوئے دیا تھا۔ یہ واقعہ تفاسیر کی تمام متداول کتابوں میں موجود ہے۔آپ کا ارشاد ہے کہ ”ایک روز رات کے وقت رفع حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔اِس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلا نہ تھے اور ہم جنگل میں جایا کرتے تھے“۔ یہ بیان اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ کی زندگی میں ہی گھروں میں بیت الخلا بن چکے تھے اور اس دور کے اپنے ماحول کے مطابق یقینا یہ ٹیکنالوجی کا ہی استعمال تھا جس کے ذریعے Drainage سے System معرض وجود میں آیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جنگی مہمات میں بہتر ٹیکنالوجی اختیار کی۔غزوۂ خندق میں کس کو معلوم نہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر خندق کھودی گئی جو عرب کی جنگی تاریخ میں پہلی دفعہ بیرونی ٹیکنالوجی کا استعمال تھا۔ اسی وجہ سے دشمن کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ پیدل سپاہی کے مقابلے میں گھڑسوار اور گھڑسواری کے مقابلے میں تیراندازی کیا بہتر ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں؟ کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہی ہے کہ میزائل و ایٹم بم کے مقابلے میں تلوار سے مقابلہ کیا جائے اور یہ توقع کی جائے کہ ہم اس طرح ہر محاذ پر فتح یاب ہوں گے کیونکہ سنت کی پیروی کا یہ لازمی نتیجہ ہے؟

اگر صاحب مضمون کا دعویٰ محض یہ ہوتا، جیسے انہوں نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ ”فضیلت، برتری، کامیابی اور استخلاف کا واحد سبب محض سائنس وٹیکنالوجی کو سمجھ لیا گیا ہے“۔(البرہان،فروری 2011، ص 58) تو ہم کہہ سکتے تھے کہ واقعی یہ واحد سبب نہیں ہے۔

لیکن کس اہلِ علم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ واحد سبب ہے؟ یقینا یہ واحد سبب نہیں لیکن اس مقدمے سے سائنس وٹیکنالوجی ترقی کے لیے غیر اہم کس طرح ثابت ہوگئی؟ اس مضمون میں قرآن کریم کی جتنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا نفس مضمون سے دور کا تعلق بھی نہیں بنتا۔ہمیں حیرت ہے کہ قرآنی آیات کا حوالہ دے کر غلط نتیجہ نکال کر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ”سائنس وٹیکنالوجی نہ جاننے والوں کو قرآن کی کسی آیت میں بھی جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی“ (البرہان،فروری،ص 59) دوسرے الفاظ میں صاحبِ مضمون ہمیں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ چونکہ سائنس وٹیکنالوجی نہ جاننے والوں کو قرآن نے جہنم کی وعید نہیں سنائی اس لیے اس کا حصول غیر اہم ہے۔ اگر اس طرزِ استدلال کو ہم علم کی معراج سمجھ کر اختیار

کرنا شروع کر دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی کسی آیت میں بھی پانی نہ پینے اور کھانا نہ کھانے والوں کو جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی لہذا پانی اور خوراک کا استعمال مسلم ترقی و سربلندی کے لیے غیر اہم ہے۔

بالکل درست کہ ''استخلاف کی کسی آیت میں کسی نبی کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ زمین میں اقتدار کے بعد سائنس و ٹیکنالوجی کے علم کی تدریس و تعلیم کو اولیت دیں گے''۔ (ایضاً ص 58) تو کیا ڈاکٹر صاحب موصوف ہمیں کسی ایک آیت کا حوالہ دے سکتے ہیں جس میں زمین میں اقتدار کے بعد پانی و خوراک کے حصول میں اولیت دی گئی ہو؟ اصل یہ ہے کہ یہ عقل عام (Common Sense)، اگرچہ یہ اتنی عام نہیں، کا تقاضا ہے کہ حیات ارضی میں بہتر سے بہتر وسائل کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ دراصل سائنس و ٹیکنالوجی کو بروئے کار لا کر ہی بہتر وسائل کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی قرآن کا حکم ہے (سورۃ الانفال آیت 60) اور یہی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی۔ کیا ڈاکٹر صاحب اور البرہان والے اپنی روز مرہ زندگی میں قرآن کے خلاف عمل کر رہے ہیں؟ مثلاً البرہان کمپیوٹر کے ذریعے کمپوز کیا جا رہا ہے یا دستی کتابت کے ذریعے؟ یہ مضمون جس قلم سے لکھا گیا ہے کیا وہ سرکنڈے کو کاٹ کر قلم تراش سے بنایا گیا ہے یا وہ پین یا بال پوائنٹ کسی فیکٹری کی ٹیکنالوجی کی پیداوار ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے مغرب کے معاشرے میں خودکشی کا سبب بھی سائنس و ٹیکنالوجی کو ہی قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''جدید مغربی تہذیب، اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اور اس کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل گلز ڈیلیوز کی خودکشی کا سبب بنے'' (البرہان، مارچ ص 42) لیکن خود ہی اپنی تردید کرتے ہوئے کانٹ اور ہیگل کے خیالات بھی پیش کر دیے کہ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ ہمیں نہیں معلوم کہ کوئی ذی شعور انسان ڈاکٹر صاحب کا مضمون پڑھ کر خودکشی کو سائنس و ٹیکنالوجی کا شاخسانہ قرار دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخی استدلال کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے روم و ایران سے مسلمانوں کی جنگوں کو بھی اپنے نظریات کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ ''مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس و ٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی'' (البرہان مارچ ص 44) ''صرف ایمان کی قوت تھی'' میں صرف پر زور دے کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان سائنس و ٹیکنالوجی سے نہ صرف کہ واقف نہیں تھے بلکہ حد درجہ لاپرواہ بھی تھے، اسی لیے مسلمانوں کو فتح ہوئی اور سائنس و ٹیکنالوجی کو شکست۔ اس استدال کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ملا عمر کے طالبان کو فتح نصیب ہوتی اور امریکہ کو شکست فاش۔ مگر نہ معلوم کہ اچانک کیا ہو گیا۔ واقعی ؎ 'مومن ہے تو بے تیغ بھی

لڑتا ہے سپاہی' کا مفہوم اب سمجھ میں آ سکتا ہے۔!

ڈاکٹر صاحب کے لیے واجب تو یہ تھا کہ وہ روم و ایران کی سائنس و ٹیکنالوجی کی مسلمانوں پر برتری ثابت کرتے تا کہ ان کی بات میں وزن پیدا ہوتا۔ حالانکہ مورخ ان کی شکست کے اسباب میں ان کی داخلی کمزوریوں کو سرفہرست رکھتے ہیں ۔ یہ دونوں طاقتیں نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہ کر کمزور ہو چکی تھیں بلکہ اندورنی خلفشار میں بھی مبتلا تھیں ۔ ایڈورڈ گبن کی مشہور زمانہ کتاب کا حوالہ دے کر ہم اپنے اوپر مغرب سے مرعوبیت کا الزام نہیں لینا چاہتے تھے مگر کیا حرج ہے کہ اس کا سرسری سا مطالعہ ہی کر لیا جائے۔

ہم اس مضمون کی اشاعت کو ''البرہان'' کے صفحات کا ضیاع ہی سمجھتے ہیں ۔ تاہم اس فکر کو شاید ''البرہان'' کی پالیسی نہ سمجھا جا سکے ۔ کیونکہ اسی شمارے کے آخر میں پروفیسر ارشد جاوید صاحب کی کتاب کا تعارف کروایا گیا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ'' مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج سیاسی ، سائنسی ،طبی و علمی ۔۔۔۔ وہ دور اب بھی واپس آ سکتا ہے جس میں مسلم تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں'' (البرہان ، مارچ ص 53) بلکہ زیادہ درست رویہ یہ ہوگا کہ ہم اس تحریر کا اختتام ''البرہان'' کے مدیر محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مضمون'' مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ'' کے چند جملوں پر کریں ۔

مدیر محترم رقمطراز ہیں :

۱۔'' اگر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لیں تو درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں :

انسان : اس کائنات اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ، اس نے انسان کو کائنات میں تصرف کی صلاحیت اور اختیار دیا ہے اور کائنات اس کے لیے پیدا کی ہے ۔ انسان کو اس نے زمین میں قیامت تک کے لیے سامان زیست مہیا کیا ہے تا کہ وہ یہاں بخوبی زندگی گزار سکیں ۔ (ص 46)

۲۔'' آج اہلِ مغرب کامیاب ہیں ، اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت کے راستے پر نہیں چل رہے اور دنیوی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو انہوں نے رد کر دیا ہے ۔ ان کی کامیابیوں کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منظم کر کے اسبابِ زندگی مہیا کرنے پر دوسروں سے بہتر قدرت حاصل کر لی ہے'' (ایضاً ص 48)

۱۔ دیکھیے : آل عمران ۳:۱۱۰: ۹۳

۳۔ ''آج مسلمان اس لیے دنیا میں ناکام ہیں کہ ان کا معاشرہ اور ان کی اکثریت اللہ کی اطاعت کی زندگی نہیں گزار رہی۔ اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوتے تو ان کی انسانی صلاحتیں بھی بہتر طور پر منظم ہو جاتیں، وہ اسباب زندگی مہیا کرنے پر بھی قادر ہو جاتے اور یوں دنیا میں بھی کامیاب ٹھہرتے۔ (ص 48)

۴۔ (مسلمان) احکامِ الٰہی کی عدم اطاعت کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے اس قوت سے محروم ہو جائیں گے کہ اپنی صلاحیتوں کو منظم کر سکیں اور اسبابِ زندگی مہیا کرنے پر قادر ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ (ص 40)

۵۔'' دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا طریقہ یہی ہے کہ دنیوی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری جائے اس سے نہ صرف آخرت میں کامیابی یقینی ہو جائے گی بلکہ انسانی صلاحیتوں کے بہتر استعمال کی وجہ سے مسلمان اسبابِ دنیا مہیا کرنے میں بھی دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔'' (ص 49)

اس مضمون کا خلاصہ کرتے ہوئے مدیر محترم ہمیں سائنس و ٹیکنالوجی کے بارے میں درست و معتدل رویہ اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ کے بقول'' دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سچ مچ اللہ کی اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں اور منافقت و دوعملی چھوڑ دیں۔ اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشونما ہو گی اور وہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہو جائیں گے۔ (ص 50)

اور ہمارا خیال ہے کہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی حاصل کرنے ہی کا دوسرا نام سائنس و ٹیکنالوجی کا دوسروں سے بڑھ کر استعمال ہے جو مسلمانوں کا سب سے زیادہ حق ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

وسطیہ (۲)

اسلام کا فلسفۂ اعتدال

توازن اور اعتدال میں بگاڑ کے اسباب

توازن اور اعتدال کو بگاڑنے والے اسباب بہت سے ہیں، ان تمام اسباب کی روک تھام

ا۔ تعریف اصمعی نے کی ہے، دیکھیے، ابو منصور محمد بن احمد الازھری، تہذیب اللغہ، دار احیاء التراث العربی بیروت ۲۰۰۱)۔ ۱۴۹/۹ ص ۲۷۴ء

ضروری ہے۔ ان میں ایک سبب غلو یا انتہاء پسندی ہے۔ انتہاء پسندی کا دائرہ مذہبی امور سے لے کر معاشرتی رسوم ورواج اور سیاسی افکار ونظریات سب کو محیط ہے۔

قرآن حکیم نے اہل کتاب کے غلو فی الدین کو رد کیا ہے اور دینی امور میں غلو کو ممنوع قرار دیا ہے، اہل کتاب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مقامِ رسالت سے بلند کر کے درجہ الوہیت پر فائز کر دیا تھا، انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ کر خدائی میں شریک کر دیا۔ سورہ نساء میں ارشاد ہے:

''یٰاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِيۡ دِيۡنِكُمۡ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ'' (النساء ۴:۱۷۱)

اے اہل کتاب: اپنے دین کے معاملہ میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح بن مریم تو محض اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ (نشانی) تھے۔

عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے دعوے کو اس قدر شدت سے پھیلایا کہ اس پروپیگنڈے نے دیگر مذاہب کے لوگوں سے نہ صرف تصادم کی صورت اختیار کی بلکہ تثلیث کے من گھڑت عقیدہ کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ دوسری طرف ایک پاک دامن اور باکردار خاتون پر زنا کی تہمت لگائی، یہ سب دین میں انتہاء پسندی تھی۔ ایک اور آیتِ مبارکہ میں غلو فی الدین سے اس طرح منع کیا گیا ہے:

''قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ'' (المائدہ ۵:۷۷)

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ اپنے دین کے معاملہ میں ناحق غلو نہ کرو، اور نہ لوگوں کی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرو کہ جو خود پہلے گمراہ ہوئے اور پھر بہت سے لوگوں کو سیدھے راستہ سے بھٹکایا۔

یہود ونصاریٰ دونوں کی جانب سے غلو پایا جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دے لیتے ہیں اور حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیتے ہیں، اس طرح دین میں تحریف اور افراط وتفریط کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں (۱)

تعدّی بھی اعتدال کو بگاڑنے کا ایک سبب ہوتا ہے، تعدی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی قانونی

اور اخلاقی حدود کو پامال کر کے دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ زیادتی کرے۔ عام طور پر اس کی وجہ خود غرضی، حسد، تعصب یا حرص و لالچ ہوتے ہیں، قرآن وسنت کی رو سے یہ تمام رذائل حرام ہیں۔ قرآن حکیم نے اعتداء یا تعدی کو ظلم کے مترادف قرار دیا ہے:

”وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ“ (البقرہ ۲:۲۲۹)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جائے تو ظالموں میں شامل ہے۔

اس آیت مبارکہ کا تعلق عائلی نظام سے متعلق احکام سے ہے، یہ احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں خاندان کے نظم میں اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود و قیود مقرر کر دی ہیں تاکہ خاندانی نظام کی نہ صرف حفاظت کی جا سکے بلکہ عدل کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جا سکے۔ قرآن حکیم نے تو میدان جنگ میں بھی دشمن کے ساتھ بھی اعتداء سے منع کیا ہے:

”وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡن“ (البقرہ ۲:۲۲۹)

جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں تو تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے قتال کرو مگر زیادتی نہ کرنا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔

” وَ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا“ (المائدہ:۵:۲)

اور ان لوگوں کی دشمنی جنہوں نے تمہیں مسجد حرام جانے سے روک دیا تھا، تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔

قرآن حکیم میں تقریباً ۳۴ (چونتیس) آیات ہیں جن میں اعتداء کا ذکر ہے، جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ قرار دیا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے ہدایات دیں ہیں۔

اعتدال اور توازن میں بگاڑ کا ایک اہم سبب ظلم ہے۔ مسلمان مفکرین کے بقول ظلم کا مفہوم یہ ہے وضع الشیئی فی غیر محله(۱) یعنی کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر غیر موزوں مقام پر رکھنا ظلم ہے۔ اس تعریف کے لحاظ سے ظلم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں وہ تمام اسباب بھی آجاتے ہیں جنہیں ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، یہاں ہم اس کو ایک بڑے سبب کے طور پر الگ سے بیان کر رہے ہیں اور ظلم کی اصطلاح کو اس معروف مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں جس مفہوم میں آج ہمارے معاشرہ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی فرد، جماعت یا علاقہ کے لوگوں

کے جان، مال اور علاقوں پر جارحیت کا ارتکاب کرنا۔

ظلم جسمانی تشدد کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے، معاشی استحصال کی صورت میں بھی ہوسکتا، ناجائز سیاسی تسلط اور دباؤ کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اعتدال کی قوتوں کو سب سے زیادہ خطرہ اس ظلم سے ہوتا ہے جو ایک ملک کی جانب سے دوسرے ملک کے لوگوں پر کیا جاتا ہے۔ گزشتہ صدی کی ظلم کی بدترین مثال تو وہ ہے جو ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لیے فلسطینیوں کے علاقوں پر قبضہ کیا گیا۔ نہتے فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ اردن اور شام کے علاقوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ یہودیوں کی ناجائز بستیوں کے قیام کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہزاروں فلسطینی اب تک شہید ہو چکے ہیں، ہزاروں بے گھر ہو گئے ہیں، ان کے گھروں اور بستیوں پر غاصبوں کا قبضہ ہے۔ مظلوم فلسطینیوں کی کوئی دادرسی نہیں ہوئی۔ فلسطینیوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں میں صرف اسرائیل تنہا نہیں، اس میں امریکہ سمیت بہت سی طاقتیں شریک ہیں۔

فلسطینیوں کی طرح کشمیری بھی مظلوم ہیں۔ بھارتی حکومت اور فوج نے گذشتہ ساٹھ سالوں میں سیکڑوں کشمیریوں کو شہید کیا۔ اقوام متحدہ نے قرار داد کے ذریعہ جو رائے شماری کا حق دیا تھا کشمیری آج تک اس سے محروم ہیں۔ کون سا ظلم ہے جو بھارتی حکومت اور فوج نے ان پر نہ ڈھایا ہو حتی کہ انہیں بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں۔ نہتے نوجوانوں، خواتین اور بچوں پر ہر قسم کا تشدد کیا جا رہا ہے۔

سرزمین عراق بھی امریکیوں کے ظلم سے محفوظ نہیں رہی، امریکیوں نے یہ بہانہ بنا کر حملہ کیا تھا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، لیکن آج تک وہ ہتھیار عراق میں دستیاب نہیں ہو سکے، اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جس ملک کے پاس وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہوں تو اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے تو اس پر بہت سے ترقی یافتہ ممالک پورے اتریں گے۔ کیا ان کے خلاف بھی ایسی ہی کارروائی ہونی چاہیے؟ عراقی تو بیچارے

۱۔ بخاری، الجامع الصحیح، ابواب المظالم۔ مسلم، الجامع الصحیح، باب نصر المسلم ظالماً او مظلوماً

۲۔ وھبہ زحیلی، بین الاقوامی تعلقات، ترجمہ حکیم اللہ، شریعہ اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۸

امریکی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ لاکھوں معصوم انسان امریکی بمباری کے نتیجہ میں ہلاک، اپاہج اور معذور ہو گئے، عراقیوں کے تیل اور دیگر وسائل پر ناجائز قبضہ جما لیا گیا۔ آج عراقی بیرونی جارحیت اور ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

افغانستان بھی بیرونی ظلم کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ افغانیوں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کسی بیرونی استعمار کی غلامی کو قبول نہیں کرتے۔ افغانستان پہلے روسیوں کی جارحیت کا شکار ہوا۔ افغانی پوری جرأت کے ساتھ سالہا سال روسی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اب یہ افغان امریکی اور اس کے اتحادی استعمار

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام.................. پتہ..

....

فون نمبر.. ای میل...............................

چیک بنام ارقم فاؤنڈیشن اور منی آرڈر بنام ایڈیٹر، 136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے۔

کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ طاقت کا توازن افغانیوں کے حق میں بہت کمزور ہے، اس لیے استعمار کو مکمل

شکست سے دو چار ہونے میں وقت لگ رہا ہے۔ بہر حال عدل و انصاف کی نظر سے دیکھنے والے افغانیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ظلم کی ایک اور مثال پاکستان کے شمالی علاقوں میں بیرونی ڈرون حملے ہیں۔ شمالی علاقوں کے بے شمار لوگ بمباری کی وجہ سے ہلاک، زخمی اور اپاہج ہو رہے ہیں، جو لوگ ڈرون حملوں کا شکار ہو رہے ہیں انہیں ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مجرم: یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے خلاف کوئی جرم عدالتی یا مجاز عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں ثابت ہو چکا ہو۔ ہماری معلومات کی حد تک ان حملوں میں کوئی مجرم ہلاک نہیں ہوا۔

ملزم: دوسرا درجہ ملزم کا ہے۔ ملزم وہ ہوتا ہے جس کے خلاف کوئی الزام عائد کیا گیا ہو۔ ایسے فرد کے بارے میں دونوں احتمال ہوتے ہیں وہ معصوم بھی ہو سکتا ہے اور مجرم بھی۔ دنیا کے کسی قانون میں کسی ملزم کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے

معصوم: تیسرے وہ لوگ ہیں جو معصوم کہلاتے ہیں۔ نہ مجرم ہیں نہ ہی ملزم بلکہ عام معصوم شہری ہیں۔

شمالی علاقوں میں میزائل حملوں اور بمباری کے نتیجہ میں پانچ یا چھ فیصد لوگ ایسے ہوں گے جنہیں ملزم کہا جا سکے، باقی پچانوے فیصد معصوم شہری شہید ہو رہے ہیں جن میں بوڑھے، بچے اور خواتین شامل ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اس ظلم کے خلاف کوئی مؤثر آواز نہیں اٹھائی گئی۔ آخر آزادی کے ان متوالوں کا خون ناحق کب تک بہتا رہے گا! تقریباً پچاس برس قبل ویت نام کے بے گناہ شہری بھی سالہا سال تک امریکی بربریت اور ظلم و ستم کا شکار رہے، لیکن جارح استعمار کے خلاف بڑے عزم و ہمت اور دلجمعی کے ساتھ لڑتے رہے۔ بالآخر ظالم قوت کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ چند واقعات بطور مثال یہاں بیان کیے گئے ہیں، ورنہ استعماری قوتوں کی داستان ظلم و ستم بہت طویل ہے، یہ مقالہ ظلم کی مزید داستانوں کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان مثالوں کو بھی یہاں صرف اس لیے بیان کیا گیا ہے تا کہ اس بات کی وضاحت کی جا سکے کہ بین الاقوامی طور پر لوگوں میں بے چینی، خوف و دہشت پھیلنے کے اسباب کیا ہیں، اعتدال اور توازن میں بگاڑ کیوں پیدا ہو رہا ہے اور پھر نتیجتاً کس قسم کا ردعمل پیدا ہو رہا ہے۔

قرآن حکیم نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے لیکن مظلوم کو نہ صرف یہ کہ بدلہ لینے کا حق دیا ہے، بلکہ مظلوم کی دادرسی کو بھی ضروری قرار دیا:

"وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْل" (الشوری ۴۲:۴۱)

اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو ان پر کوئی الزام نہیں۔

"اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" (الشوری ۴۲:۴۲)

الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

"وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا" (الاسراء ۱۷:۳۳)

اور جو شخص بطور ظلم قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وارث کو (قصاص کا) حق دیا ہے، اسے چاہیے کہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی۔

"اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ" (الحج ۲۲:۳۹،۴۰)

جن لوگوں پر (خوامخواہ) جنگ مسلط کی گئی، انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بھی لڑیں، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ ان کا قصور سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

ان آیات سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مظلوم کو بے یارومددگار نہ چھوڑا جائے، گویا شرعاً مظلوم کی مدد کرنا فرض ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے

انصر اخاک ظالما او مظلوما (۱)

اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ظالم کی کیسے مدد کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو۔

ہمارے فقہاء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ ضروری ہے، اور جنگ کا محرک بھی ظلم ہی کا خاتمہ ہے نہ کہ مذہبی مخالفت۔ احناف کی رائے یہ ہے کہ انسان کی زندگی و حیات قابل احترم ہے اسے شرعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا موقع ملنا چاہیے، جبکہ قتل کی اباحت عارضی ہے جس کی اجازت شر کو دفع

کرنے کے لیے دی گئی ہے۔فقہاء احناف کی رائے ہے کہ محض کفر،کفار کے ساتھ جنگ کا سبب نہیں بلکہ ظلم وشراس کا سبب ہوتا ہے۔امام مالکؒ کے نزدیک بھی کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا خون بہائے یا دوسرے کا۔ہاں مگر حق کے ساتھ۔(۲)

ہماری مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مظلوم کو نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ہے،جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"لاَیُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا عَلِیْماً"[النساء ۴:۱۴۸]

اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کو علانیہ برا بھلا کہا جائے،ہاں مگر جو مظلوم ہے اسے حق ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مظلوم کو نہ صرف بدلہ لینے اور جوابی کارروائی کرنے کا حق ہے بلکہ مظلوم کی بھر پور حمایت کرنا بھی تمام انصاف پسند لوگوں کے لیے ضروری ہے۔انہیں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔عدل و انصاف کی خاطر تمام منصف مزاج لوگوں اور قوموں کو مظلوم کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔اس لیے کہ عدل کے بغیر اعتدال کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔دنیا بھر میں اعتدال وتوازن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام اسباب کا سدباب کیا جائے جن سے نفرتیں اور دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ایک پر امن اور پرسکون معاشرہ قائم کرنے کے لیے ہمیں ظلم،عداوت،تعصّبات،نفرتوں اور ناانصافیوں کو ہر سطح پر ختم کرنا ہوگا۔

مدیر کے نام

☆ محلے کی مسجد میں پہلے آپ سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوجاتی تھی۔ اب میں پچھلے کئی ماہ سے علیل ہوں چل بھی نہیں سکتا اس لیے مسجد جانے سے بھی معذور ہوں۔ اب نظر بھی تقریباً بند ہوگئی ہے اور میرے لیے پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ اس کے باوجود میں البرہان کی زراعانت کے ۴۰۰ روپے بھجوا رہا ہوں تا کہ اس میں میرا حصہ بھی شامل ہوجائے۔ البرہان بہت معیاری پرچہ ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔

عبدالرشید، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

☆ میں آپ کے ماہنامہ ''البرہان لاہور'' کا باقاعدہ قاری ہوں۔ جو درد اور احساس آپ کے دل میں ہے اور جو آپ کی تحریروں سے بھی عیاں ہے وہ قابل تحسین اور لائق داد ہے۔ اس وقت ملک عزیز چاروں طرف سے گھمبیر مسائل کا شکار ہے اور ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ ان سب مسائل کا واحد حل صرف اور صرف معیاری اور بامقصد تعلیم و تربیت میں پنہاں ہے۔ آپ ان مسائل کے حل کے لیے تگ و دو کررہے ہیں اور ''اپنے حصے کی شمع'' روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ شمع روشن کرنے والوں اور اس کے لیے تگ و دو کرنے والوں کو میرا اسلام پہنچا دیجیے گا۔